اقبال اور عشقِ رسولؐ



پروفیسر سیّد محمد عبد الرشید

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، ۱۳۹۱، گلی کوتانہ سوئیوالان نئی دہلی

اقبال اور عشقِ رسولؐ

پروفیسر سیّد محمد عبد الرّشید

بارِ دوم

سنِ طباعت ۱۹۸۳ء

کتابت .... قطب الدین احمد شیرکوٹی

تصحیح بہار الٰہ آبادی ....

زیرِ نگرانی .... اعتقاد حسین صدیقی

طباعت .... کلر پرنٹنگ پریس دہلی ۶

قیمت .... بیس روپیہ ۲۰/-

باہر سے آنے والے حضرات اس پتہ پر ملیں

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس 5/11 گلی میٹیا محل دہلی ۶

اقبال اور عشقِ رسولؐ

مصنّف

پروفیسر سیّد محمد عبد الرّشید

ناشر

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۱۴۹۱ گلی کوتانہ سوئیوالان

دھلی ۱۱۰۰۰۲

اِنتساب

میں اپنی ناچیز کوشش "اقبالؔ اور عشقِ رسولؐ"، کو عاشقانِ رسالت مآبؐ کے نام پر معنون کرتا ہوں کہ میرے نزدیک اُن سے زیادہ مبارک و محترم اور کوئی نہیں۔ معمولی صاحبانِ ثروت و منصب کا تو ذکر ہی کیا، شاہانِ عالم بھی ان کی قدر و منزلت پر رشک کرتے ہیں۔ اور کیوں نہ کریں ؎

ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

ہیچمدان

پروفیسر سید محمد عبد الرشید

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کسی کے عشق کی داستان لکھ دینا آسان ہے۔ کیوں کر عشق ہوا عشق کے ـوں کیا کیا دیکھنا نصیب ہوا مثلاً حسن و جمال اور ناز و ادا کا دیکھنا تھا کہ دل ـھ سے جاتا رہا، کسی بات کا ہوش نہیں اٹھتے بیٹھتے دوست کا خیال ہے ـر دوست کی یاد۔ جنون کی نوبت آئی تو کپڑے پھاڑ لئے۔ گھر اور آبادی کو ـوڑ کر جنگل بیابان کو نکل گئے اور بادیہ پیمائی شروع کر دی، پیروں میں ـنٹے چبھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے قاقم و سنجاب پر چل رہے ہیں۔ تپتی ہوئی ـت گلاب کے پھولوں کا فرش معلوم ہوتی ہے۔ یہ اور اسی قسم کی بیشمار باتیں جو ـھنے اور سننے میں آتی ہیں، بیان کی جا سکتی ہیں۔ مگر کیا آج تک کوئی شاعر ـکیم نکتہ داں عشق کی تعریف کا بھی حق ادا کر سکا ہے؟ کیا عشق کی کیفیات ـارادات کے ناپنے کا پیمانہ ہمارے پاس موجود ہے؟

عاشق کے دل پر دوست کی جدائی میں کیا گذرتی ہے، رشک باقیامت ڈھاتا ہے۔ دوست کی اداؤں کا دل پر کیسا اثر ہوتا

ہے، پھر جس پر دل آیا ہے اس کے مقابلے میں دنیا جہان کے دوسرے حسینوں کی اداؤں اور اُس کے حُسن جمال کا دل پر کیوں نہیں اثر ہوتا۔ ایک شخص پکار رہا ہے ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ　　ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں!

دیکھنے والا اس کے جسم کی حرکت، اس کے چہرے کا رنگ دیکھتا اور اس کی آواز سُنتا ہے، مگر کیا اس جذبۂ دل اور کیفیتِ قلبی کو بھی دیکھ سکتا ہے جس سے یہ شعر زبان پر آیا ہے؟ اور یہ تو عام عشق و محبت کی باتیں ہیں۔ ذرا اس شخص کی مشکلات کا اندازہ کیجئے جو "عشقِ رسول ؐ" پر مضمون لکھنا چاہتا ہے۔ جہاں عشق کی تعریف بھی بدل جاتی ہے اور نوعیت بھی۔ کیفیات و واردات کی اثر انگیزی بھی اور اس کے اسباب و علل اور محرکات بھی بدل جاتے ہیں۔

عشقِ رسول ؐ سے بڑھ کر اور کونسی چیز ہو سکتی ہے! خدا کی معرفت بلکہ ... خوشنودئ خدا بھی اسی پر موقوف ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وجہ آفرینش اور مقصدِ حیاتِ انسانی عشقِ رسول ؐ کے سوا کچھ نہیں۔ کیا ایسی عظیم الشان چیز کا بیان آسان ہے! پھر اس کے ساتھ یہ دکھلانا کہ اقبالؔ کے نزدیک عشقِ رسول ؐ سے کیا مراد ہے اور وہ خود ایک بلند پایہ فلسفی ہوتے ہوئے اکثر فلا کی طرح مائل بہ تشکیک و الحاد ہونے کی بجائے ایسے گرویدۂ اسلام اور ر عاشقِ رسول ؐ کیسے ہوئے کہ اپنے تمام تفلسف اور عقلیت کو ایک متاعِ حقیر کی طرح حضور سرورِ کائنات ؐ کے قدموں پر لا ڈالا! وہ کیا اسباب تھے جو اس قلبِ ماہیت کا باعث ہوئے۔ اُس کے لئے اقبالؔ کی پوری زندگی جائزہ لینا ہوگا۔ اُن کی طفلی، ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور ماحول ک اثر، کن شخصیتوں سے اثر قبول کیا، مطالعے کی نوعیت اور خو۔ اُن کے ذا مشاہدات، غرض کہ پوری سوانح حیات کی چھان بین کرنی ہوگی۔ ان تصانیف ایک ایک سطر بلکہ ایک ایک لفظ کا بغور مطالعہ کر

یہ معلوم کرنا ہوگا کہ حضورِ اکرمؐ کی کن صفات نے اُن کا دل موہ لیا ہے۔ پھر یہ کہ یہ آگ ان کے سینے میں کب لگی، کس طرح تیز ہوتی گئی اور کب اس حد کو پہنچی کہ جب انھوں نے اپنے تمام فلسفے کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا ؎

مرا درسِ حکیماں دردِ سر داد　　　کہ من پروردۂ فیضِ نگاہم

عاشقانِ رسولؐ نے طرح طرح سے اپنے عشق کا اظہار کیا ہے۔ اور حضورؐ کی جناب میں بہتر سے بہتر اسلوب بیان اور اچھے سے اچھے الفاظ کے ذریعے ہدیۂ عقیدت و نیاز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حسّان بن ثابتؓ اور کعبؓ بن زہیر سے لیکر حکیم سنائیؒ، مولانا رومؒ، خاقانی، جامیؒ، عرفی، شہیدیؒ، غلام امام شہیدؒ، محسن کاکوری اور غالب تک سبھی نے بقدرِ ہمت اس فضائے بیکراں میں اپنے طائرِ فکر کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہر ایک کو اس کام کی نزاکت اور اس کی بھاری ذمہ داریوں کا احساس بھی رہا ہے۔ اگرچہ محبت کی باتیں عقل و خرد کی باتوں سے مختلف ہوتی ہیں مگر ؏:-

باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار!

بھی کسی عاشقِ رسولؐ ہی کی زبان سے نکلا ہے۔ خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی تعریف کو پسند فرمایا ہے جو واقعیت پر مبنی ہو۔ یہاں تک کہ حضرت کعبؓ کے قلم سے حضورؐ کی شان میں "سیفٌ مِن سُیوفِ الھند" نکل گیا۔ تو رحمت اللعالمین نے اس کی بھی اصلاح فرما دی کہ سیفٌ من سیوف اللہ کہنا چاہئے۔ اسی نزاکت کے پیشِ نظر عرفی نے کہا تھا کہ ؎

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا است　　　آہستہ رہ کہ بر دمِ تیغ است قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن　　　نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے وجم را

اور غالب کو کہنا پڑا تھا کہ ؎

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

ہے، پھر جس پر دل آیا ہے اس کے مقابلے میں دنیا جہان کے دوسرے حسینوں کی اداؤں اور اُس کے حسن جمال کا دل پر کیوں نہیں اثر ہوتا۔ ایک شخص پکار رہا ہے ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں!

دیکھنے والا اس کے جسم کی حرکت، اس کے چہرے کا رنگ دیکھتا اور اس کی آواز سنتا ہے، مگر کیا اس جذبۂ دل اور کیفیتِ قلبی کو بھی دیکھ سکتا ہے جس سے یہ شعر زبان پر آیا ہے؟ اور یہ تو عام عشق و محبت کی باتیں ہیں۔ ذرا اس شخص کی مشکلات کا اندازہ کیجئے جو "عشقِ رسول ؐ" پر مضمون لکھنا چاہتا ہے۔ جہاں عشق کی تعریف بھی بدل جاتی ہے اور نوعیت بھی۔ کیفیات و واردات کی اثر انگیزی بھی اور اس کے اسباب و علل اور محرکات بھی بدل جاتے ہیں۔ عشقِ رسول ؐ سے بڑھ کر اور کونسی چیز ہو سکتی ہے! خدا کی معرفت بلکہ... خوشنودئ خدا بھی اسی پر موقوف ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وجہ آفرینش اور مقصدِ حیاتِ انسانی عشقِ رسول ؐ کے سوا کچھ نہیں۔ کیا ایسی عظیم الشان چیز کا بیان آسان ہے! پھر اس کے ساتھ یہ دکھلانا کہ اقبالؔ کے نزدیک عشقِ رسول ؐ سے کیا مراد ہے اور وہ خود ایک بلند پایہ فلسفی ہوتے ہوئے اکثر فلا... کی طرح مائل بہ تشکیک و الحاد ہونے کی بجائے ایسے گرویدۂ اسلام اور ... عاشقِ رسول ؐ کیسے ہوئے کہ اپنے تمام تفلسف اور عقلیت کو ایک متاعِ حقیر کی طرح حضور سرورِ کائنات ؐ کے قدموں پر لا ڈالا! وہ کیا اسباب تھے جو اس قلبِ ماہیت کا باعث ہوئے۔ اُس کے لئے اقبالؔ کی پوری زندگی کا جائزہ لینا ہوگا۔ اُن کی طفلی، ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور ماحول کا اثر، کن شخصیتوں سے اثر قبول کیا، مطالعے کی نوعیت اور خو... اُن کے ذا... مشاہدات، غرض کہ پوری سوانح حیات کی چھان بین کرنی ہوگی۔ ان... تصانیف ایک ایک سطر بلکہ ایک ایک لفظ کا بغور مطالعہ کر...

یہ معلوم کرنا ہوگا کہ حضورِ اکرمؐ کی کن صفات نے اُن کا دل موہ لیا ہے۔ پھر یہ کہ یہ آگ ان کے سینے میں کب لگی، کس طرح تیز ہوتی گئی اور کب اس حد کو پہنچی کہ جب انھوں نے اپنے تمام فلسفے کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا ؎

مرا درسِ حکیماں دردِ سر داد کہ من پروردۂ فیضِ نگاہم

عاشقانِ رسولؐ نے طرح طرح سے اپنے عشق کا اظہار کیا ہے۔ اور حضورؐ کی جناب میں بہتر سے بہتر اسلوبِ بیان اور اچھے سے اچھے الفاظ کے ذریعے ہدیۂ عقیدت و نیاز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حسّان بن ثابتؓ اور کعبؓ بن زُہیر سے لیکر حکیم سنائیؒ، مولانا رومؒ، خاقانی، جامیؒ، عرفی، شہیدیؒ، غلام امام شہیدؒ، محسن کاکوری اور غالب تک سبھی نے بقدرِ ہمت اس فضائے بیکراں میں اپنے طائرِ فکر کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہر ایک کو اس کام کی نزاکت اور اس کی بھاری ذمہ داریوں کا احساس بھی رہا ہے۔ اگرچہ محبت کی باتیں عقل و خرد کی باتوں سے مختلف ہوتی ہیں مگر ع:-

با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار!

بھی کسی عاشقِ رسولؐ ہی کی زبان سے نکلا ہے۔ خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی تعریف کو پسند فرمایا ہے جو واقعیت پر مبنی ہو۔ یہاں تک کہ حضرت کعبؓ کے قلم سے حضورؐ کی شان میں "سیفٌ من سُیوف الھند" نکل گیا۔ تو رحمت اللعالمین نے اس کی بھی اصلاح فرما دی کہ سیفٌ من سیوف اللہ کہنا چاہئے۔ اسی نزاکت کے پیشِ نظر عرفی نے کہا تھا کہ ؎

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحراست آہستہ رہ کہ بر دمِ تیغ است قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے وجم را

اور غالب کو کہنا پڑا تھا کہ ؎

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

اس لئے یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ اقبال اس مرحلۂ دشوار سے گذرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ پھر عشق نہ بوالہوسی کا نام ہے اور نہ یہ خلل دماغ اور فتورِ عقل ہے۔ بلکہ ایک وجدانی کیفیت، روحانی مسرت اور کسی بلند مقصد کے لئے عقل و حواس اور شعور کی تمام قوتوں کے ساتھ بے چینی اور والہانہ تڑپ اور اس کے حصول کے لئے ہمہ تن وقف ہو جانے کا نام عشق ہے۔ اقبال کا بھی ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ رسولِ کریمؐ کی حیاتِ طیبہ کو ساری دنیا کے لئے شمعِ ہدایت کو وسیلۂ کامیابی سمجھتے ہیں۔ اس کے لے اس زیادہ سے زیادہ اشاعت چاہتے ہیں۔ اور ساری دنیا کو اس سے واقف کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ اس سلسلے میں یہ دیکھنا ہو گا کہ حضورؐ کی جن صفات کو وہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی فلاح و کامرانی کے لے، ضروری سمجھتے ہیں، اُن صفات سے خود ان کا تاثر کس نوعیت کا ہے۔ اور انھوں نے اپنے تاثرات کو کن الفاظ اور کیسے اسالیب کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ فارسی اور اُردو کے دوسرے نعت گو شعرا اور اقبال کے اندازِ بیان میں کیا فرق ہے۔ غرضکہ اس قدر گوناگوں ... دشواریاں تھیں مگر اس موضوع پر لکھنا افادی حیثیت سے ضروری بھی تھا اس لئے باوجود ان تمام دشواریوں کو میں نے اپنا خیال ترک نہیں کیا۔ اور اپنی امکانی کوشش سے کام لے کر اقبال کے "عشقِ رسولؐ کا ایک مرقع" نہیں ایک تصویر بلکہ تصویر بھی نہیں کہہ سکتا بلکہ نا تمام خاکہ تیار کیا ہے۔ جس کو ناظرین کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

عشقِ رسولؐ کی ابتدا خدا سے ہوئی۔ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ اور لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کے اقرار کا حکم اور خدا اور اس کے فرشتوں کا حضورؐ پر درود و سلام بھیجنا اس پر گواہ ہے۔ نیز قرآن پڑھیئے تو اوّل سے آخر تک ذکرِ رسولؐ کے ترانوں سے معمور ہے۔ کہیں حضورؐ کے اخلاق کی تعریف کی جاتی ہے، کہیں آپؐ کی جان کی قسم کھائی جاتی ہے، کہیں آپؐ کی حفاظت کا

ذمہ لیا جاتا ہے، کہیں آپؐ کے علوِ مرتبت کو بیان کیا جاتا ہے، کہیں دلجوئی و دلداری کی جاتی ہے، کہیں اپنی صفات سے آپ کو متصف کیا جاتا ہے۔ مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا فَاَکْثَرَ ذِکْرَہٗ کے رو سے یہ تمام باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ خدا عاشقِ رسولؐ ہے اور یہی نہیں کہ عاشقِ رسولؐ ہے بلکہ رسولؐ کے چاہنے والوں کا بھی عاشق ہے اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ اس پر شاہد ہے۔ ملائکہ بھی عاشقِ رسولؐ ہیں۔ حضورؐ پر دُرود و سلام بھیجتے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جو فرشتے ایک دفعہ حضورؐ کے روضۂ انور پر حاضر ہو لیتے ہیں وہ تمام عمر دوبارہ حاضر ہونے کی آرزو رکھتے ہیں۔ غالب نے ذیل کی عبارت میں غالبًا اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"حاملانِ عرش را اندوہے کہ در عالمِ فرضِ محال نیز نشانش نیست، اگر ہست جز رشکِ طالع جبیں سایان سنگ آستانش نیست [۵]"

صحابۂ اکرام کے عشق کا تو کہنا ہی کیا! اگر کسی ایک صحابیؓ کے عشق کا حال بیان کرنا چاہیں تو ایک دفتر چاہیئے۔ اسی طرح قرونِ اولیٰ سے لے کر آج تک عاشقانِ رسولؐ برابر ہوتے رہے ہیں۔ اور قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ بلکہ مسلمان نے تو ہمیشہ اسی چیز کو اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھا۔ ایسا سرمایہ کہ جانِ عزیز کے عوض بھی ہاتھ آئے تو ارزاں ہے۔ اور آج بھی جبکہ مسلمان اخلاقی و دینی اعتبار سے پستی کی انتہا کو پہنچ چکا ہے اپنے آقا و مولا (فداہ امی و ابی) کا ویسا ہی دیوانہ ہے۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کو ان اشعار میں ظاہر کیا ہے۔

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربیؐ کو چھوڑا؟ بُت گری پیشہ کیا؟ بُت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو، عشق آشفتہ سری کو چھوڑا؟ رسمِ سلمانؓ و اویسِ قرنیؓ کو چھوڑا؟

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشیؓ رکھتے ہیں

۵۔ دیباچہ مہر نیمروز۔

اور جب کہ ایک طرف خدا فرماتا ہے قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ اور دوسری طرف خود حضورؐ کا ارشاد ہے کہ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ تو اللہ نے جتنی زیادہ بصیرت کسی کو دی ہے وہ اتنا ہی زیادہ حضورؐ سے محبت کرتا ہے۔ اقبال تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ ؎

معنیِ حرفم کنی تحقیق اگر | بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ | از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

عشق کسی کے جمال و کمال یا جود و نوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے یا براہِ راست اس سے متمتع ہونے سے پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ع

بسا کیں دولت از گفتار خیزد

مبارک تھے وہ لوگ جنہوں نے اس پیکرِ حسن و جمال اور سراپا جود و کمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس کے انوار سے آنکھیں روشن کیں اور اس کے فیوض و برکات سے دامنِ جاں بھر لیا۔ مگر وہ لوگ بھی کم خوش نصیب نہیں جو اس کی تعریف سُن کر اس کے شیدا ہو گئے۔ آخر اویس قرنیؓ نے حضورؐ کو کب دیکھا تھا! اور کیا اُس ہستی کو نادیدہ کہہ بھی سکتے ہیں جس کے محامد و فضائل السانِ تو انسان خود اللہ بیان کرتا ہے، قرآن کا حرف حرف جس کی صورت و سیرت کا آئینہ دار ہے جس کے انوار سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ جگمگا رہا ہے۔ کیا آفتاب، بادل کی نقاب چہرے پر ڈال لینے سے غائب ہو جاتا ہے اور دنیائے منوّر اس کی موجودگی کا پتہ نہیں دیتی؟ پھر وہ آفتاب کیونکر غائب ہو گیا جس کے انوار سے آج بھی دنیا معمور ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو دنیا میں اگر کہیں اجالا ہے تو اسی کے جمالِ جہاں آرا کا ہے ورنہ سائنس اور تہذیب جدید کی روشنی نے اندھیروں کے پھیلانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

حضورؐ کے سیرت نگاروں نے صحابۂ کرامؓ کے بیانات سے ثابت کرنے

کی کوشش کی ہے کہ حضورؐ جسمانی حسن و جمال بھی اس مقام پر تھے جہاں آج تک کوئی نہ پہنچا۔ مثلاً حضرت ابوہریرہ رضؓ فرماتے ہیں مَا رَاَیْتُ اَحْسَنَ مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلّم کَاَنَّ الشَّمْسَ تَجْرِیْ فِیْ وَجْہِہٖ! میں نے حضورؐ سے زیادہ حسین کوئی نہ دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آپ کے چہرے میں آفتاب گردش کر رہا ہے یا جیسا حضرتِ حسّانؓ فرماتے ہیں ؎

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِنْ کُلِّ عَیْبٍ　　　کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

آپؐ تمام عیبوں سے پاک کئے گئے ہیں۔ گویا آپ جس طرح چاہتے تھے اُسی طرح تخلیق کئے گئے۔

وَاَحْسَنُ مِنْکَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَیْنِیْ　　　اَجْمَلُ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

آپ سے زیادہ حسین میری آنکھوں نے کہیں نہیں دیکھا اور آپ سے زیادہ خوبصورت فرزند کسی عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا۔

حضرت انسؓ اور حضرت جابرؓ سے بھی اسی قسم کی روایات منقول ہیں"[۱]

یہ بیانات بالکل صحیح بلکہ چودہ سو برس میں جس قدر حضورؐ کے حسن و جمال کی تعریف آپ کے عاشقوں نے کی ہے وہ سب درست۔ مگر ان شواہد کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے جب کہ خدا حضورؐ کو سِرَاجًا مُّنِیْرًا کے لقب سے یاد فرماتا ہے اور ؎

وَاللَّیْلِ اشارتے زموئش　　　وَالشَّمْسِ عبارتے زرویش

اور اگر انسانی شہادت ہی کی ضرورت ہے تو حضورؐ کے چچا ابوطالب کا یہ شعر کافی ہے ؎

وَاَبْیَضُ یُسْتَسْقَی الْغَمَامُ بِوَجْہِہٖ　　　ثِمَالُ الْیَتَامٰی عِصْمَۃُ الْاَرَامِلِ

وہ ایسے نورانی شکل والے ہیں جن کے چہرے کے وسیلے سے لوگ طلب باراں کرتے ہیں۔ یتیموں کے فریادرس۔ بیواؤں کے محافظ"[۲]

---

[۱] فاران سیرت نمبر صفحہ ۲۸۲ - ۲۸۰۔ [۲] فاران سیرت صفحہ نمبر ۲۸۱ -

یا پھر حضورؐ کی رفیقۂ حیات حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر اور کس کی شہادت ہو سکتی ہے۔ " وَقَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِیْمٌ" والی آیت کی تفسیر کے ذیل میں آپ سے روایت ہے کہ فرمایا لَوْ رَاَیْنَ حُسْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیَقْتُلْنَ اَنْفُسَهُنَّ اَوْ قَالَتْ كَنَّ ۔ یعنی حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اگر زنانِ مصر حضورؐ کے جمال کو دیکھ لیتیں تو حُسنِ نبویؐ کی تاب نہ لا کر بجائے ہاتھ کاٹنے کے حیرت میں آپ ہی کو قتل کر لیتیں"۔ [1]

خیر یہ تو مضمون کی مختصر تمہید تھی۔ زیرِ بحث " اقبالؔ اور عشقِ رسولؐ ہے۔ لہٰذا اب اصل مضمون سے گفتگو کی جاتی ہے۔

اقبالؔ کے عشقِ رسول کے اسباب کو مندرجہ ذیل عنوانات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) بچپن کی تربیت اور ماں باپ کا اثر
(۲) ابتدائی تعلیم اور ماحول
(۳) اُستاد کی صحبت
(۴) غالبؔ اور حالیؔ کا اثر
(۵) وسیع مطالعۂ کتب اور ذاتی مشاہدات

بچپن کی تربیت اور ماں باپ کا اثر

اقبالؔ کے والد شیخ نور محمد بڑے نیک اور اللہ والے بزرگ تھے۔ یہاں تک کہ اپنی نیکی اور پرہیزگاری ہی کی وجہ سے اپنے شہر میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ دنیا کے کاموں میں جی بہت کم لگتا تھا۔ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے اور دین کی باتیں سننے کا بڑا شوق تھا۔ اسلام کی محبت اور پیغمبرِ اسلام کا عشق ان کی زندگی تھی۔ دنیا کے کاموں سے جتنا وقت بچتا اس میں یا بزرگوں کی کتابوں کا مطالعہ کرنے یا نیک لوگوں کی صحبت سے

---

[1] تفسیر روح المعانی

استفادہ۔ مولانا روم کے بھی بڑے عاشق تھے۔ مثنوی کے اشعار بڑے لطف سے پڑھا کرتے تھے۔ صوفی منش آدمی تھے مگر ان کا تصوّف ایسا نہ تھا کہ زندگی کے روزمرّہ کے فرائض کو بالائے طاق رکھ کر گوشہ نشین ہو جاتے، یا کسی... خانقاہ میں جا بیٹھتے۔ ساری ہی عمر اپنی محنت سے روزی کمائی" اور "دل بہ یار و دست بکار" پر عامل رہے۔ ساتھ ہی بڑے صابر و قانع اور بڑے سادگی پسند تھے۔ اُن پر مذہب کا رنگ کتنا گہرا تھا۔ یہ بات ذیل کے واقعے سے معلوم ہو سکتی ہے۔

"اقبالؔ ابھی چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے کہ ایک دن اُن کے والد صبح سویرے مولوی میر حسن صاحب کے یہاں پہنچے اور کہنے لگے "مولوی صاحب! میں سوچتا ہوں کہ اقبالؔ آخر انگریزی کی تعلیم پا کر کیا کرے گا! اُسے مذہب کی تعلیم کیوں نہ دی جائے جس سے اس کی عاقبت سدھر جائے اور دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔ میرے خیال میں یہی اچھا ہے کہ اقبالؔ اسکول جانے کی بجائے مسجد میں آپ سے دینیات پڑھ لیا کرے"[1]

اقبالؔ نے "رموزِ بے خودی" میں اپنے والد بزرگوار کی خدا ترسی، غریب نوازی اور دینداری کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک دن ایک گدائے مُبرم ہمارے دروازے پر صدا لگا رہا تھا۔ میں نے غصّے میں آ کر ایک لکڑی اس کے سر پر ایسی ماری کہ جو کچھ مانگ کر لایا تھا وہ بھی اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ جوانی کے نشے میں عقل صواب و ناصواب نہیں دیکھتی۔ مگر میرے اس فعل سے والد کو بڑا رنج ہوا، چہرہ افسردہ ہو گیا۔ دل سے آہیں نکلنے لگیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہ دیکھ کر میرا دل کانپ گیا فرمانے لگے قیامت کے دن جب حضورؐ کی اُمّت حضورؐ کے گرد جمع ہو گی۔ غازیانِ ملّت بیضا بھی اور حکمتِ دین کے حافظ بھی اور شہدا بھی، زہاد بھی اور عاشقانِ دلفگار بھی۔ عالم بھی اور شرمسار گنہگار بھی۔ سب موجود ہوں گے۔ اور

---

[1] حیاتِ اقبالؔ صفحہ ۱۲۔

اس اجتماعِ امت میں اس گدائے دردمند کا نالہ بلند ہوگا۔ تو اے صراطِ مستقیم سے دور افتادہ سرکش! اس وقت اگر حضورؐ نے پوچھا تو میں کیا جواب دونگا۔ کہ اللہ نے تجھ کو ایک مسلمان نوجوان دیا تھا تو یہ آسان کام بھی نہ کرسکا کہ اس کو آدمی بنادیتا پھر بیٹے سے اس طرح خطاب کرتے ہیں:۔

اندکے اندیشِ و یاد آور اے پسر	اجتماعِ اُمتِ خیر البشر!
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر	لرزۂ بیم و اُمیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن	پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن
غنچۂ از شاخسارِ مصطفےٰؐ	گل شو از بادِ بہارِ مصطفےٰؐ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت	بہرۂ از خلقِ او باید گرفت

اے بیٹے! ذرا اُمتِ خیر البشرؐ کے اس اجتماع کا خیال کر اور پھر میری سفید داڑھی اور اس پر امید و بیم کی وجہ سے جسم لرزاں کو دیکھ! باپ پر ایسا نازیبا ظلم روا نہ رکھ اور غلام کو آقا کے آگے رسوا نہ کر۔ تو شاخ مصطفےٰؐ کا ایک غنچہ ہے مصطفےٰؐ ہی کی بادِ بہاری سے پھول بننے کی کوشش کر (حضورؐ کے خلقِ عظیم سے بہرہ در ہونا چاہیئے)

اسی طرح انھوں نے بیان کیا ہے کہ "جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اُٹھکر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ والد مرحوم اپنے اوراد و وظائف سے فرصت پاکر آتے اور مجھے دیکھ کر گذر جاتے۔ ایک دن صبح کو میرے پاس سے گذرے تو فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔ بالآخر انھوں نے ایک مدت کے بعد یہ بات بتائی۔ ایک صبح کو جب میں حسبِ معمول قرآنِ مجید کی تلاوت کررہا تھا وہ میرے پاس آئے اور فرمایا بیٹا! کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآنِ کریم پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن کریم تم پر اُترا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔" [۱]

اقبالؔ نے اپنے ذیل کے شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہیں نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

---

[۱] اقبالِ کامل صفحہ ۱۸۔

جب اقبالؔ اسکول کی تعلیم ختم کرکے کالج میں داخل ہونے لگے تو اُن کے والد نے اُن سے عہد لیا کہ تعلیم میں کمال حاصل کرنے کے بعد اپنی زندگی خدمتِ اسلام کے لئے وقف کردیں گے۔

اقبالؔ کی والدہ بھی ان کے والد کی طرح دیندار خاتون تھیں۔ انہوں نے بھی اقبالؔ کی تربیت و نگہداشت دینِ الٰہی کے اسلوب پر کی۔ اقبالؔ نے "والدہ کی یاد میں" جو نظم لکھی ہے اُس میں فرماتے ہیں ؎

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

غرضکہ اسلام اور رسولِ اسلام سے محبت اور اولیائے کرام سے عقیدت اقبالؔ کے آباؤ اجداد کا خاصّہ رہا ہے یہی چیز اُن کے والدین کا فطری جوہر تھی اور یہی ان کو بھی وارثتہً ملی بلکہ اقبالؔ تک آتے آتے یہ شراب دو آتشہ سہ آتشہ ہو گئی۔ "التجائے مسافر" میں اپنے ماں باپ کی اس تربیت کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں ؎

پھر آرکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں کیا جنہوں نے محبت کا راز داں مجھ کو

ابتدائی تعلیم اور ماحول کا اثر

اقبالؔ کی تعلیم کا آغاز مکتب سے ہوا اور اُس زمانے کے مکتبوں میں عربی، فارسی، اُردو اور خاص کر قرآنِ کریم و دینیات ہی کی تعلیم ہوتی تھی۔ پھر ہائی اسکول میں داخل ہوئے تو مولوی میر حسن جیسے متبحر عالم اُستاد ملے جو پرانی وضع کے پکے با اصول دیندار آدمی تھے شاگرد کی ذہانت، طبّاعی اور خداداد قابلیت کو تاڑ گئے اور عربی و فارسی کے علاوہ اسلامیات اور حکمت و فلسفہ کی تعلیم بھی دی اور اس پر ایسی کوشش اور توجہ صرف کی کہ ذرہ کو آفتاب بنا کر چمکا دیا۔ چنانچہ اقبالؔ اپنی نظم "التجائے مسافر" میں اُستاد کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو

بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو | نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو | دعا یہ ہے کہ خداوندِ آسمان و زمیں

مولوی میر حسن کو درس و تدریس کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ ہر وقت پڑھنے والے کتابیں کھولے موجود رہتے۔ مولوی صاحب درس دے رہے ہیں، طالب علم سوالات کر رہے ہیں، بحث و مباحثہ ہو رہا ہے، غرضکہ علم ہی کے چرچے اور دین ہی کے تذکرے تھے۔ اس علمی و دینی ماحول نے اقبال کی آتشِ شوق کو اور بھی تیز کر دیا۔ یہاں تک کہ انھیں کھیل کود سے دلچسپی نہ رہی یا مطالعۂ کتب میں محو رہتے یا کسی گہرے تفکر میں ڈوبے ہوتے۔ اقبال کی خوش قسمتی دیکھئے کہ ان کے فلسفے کے استاد اور وہ بھی مسلمان نہیں ایک یورپین عیسائی، فارسی و عربی کے علاوہ اسلامیات سے بھی گہری دلچسپی رکھنے والے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اسلام پر ایک کتاب لکھی جو "PREACHING OF ISLAM" کے نام سے چھپ چکی ہے اور اپنے موضوع پر بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

غالب اور حالی کے اثرات

اقبال نے شروع میں اگرچہ رسماً اصلاحِ سخن مرزا داغ دہلوی سے لی مگر ان کی طبیعت کو فطری مناسبت مرزا غالب سے تھی۔ وہی فارسی تراکیب جو کہ غالب کا طرۂ امتیاز تھا، اقبال کے ہاں بھی اسی کثرت سے موجود ہیں۔ وہی بلندیٔ فکر، وہی ندرتِ مضامین اور نازک خیالی جو غالب کا سرمایۂ ناز ہے، اقبال کے کلام کی بھی خصوصیات ہیں۔ مگر یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ غالب نے نعتِ رسولؐ کا کیسا باغ لگایا ہے۔ اور اس ناواقفیت کا سبب یہ ہے کہ غالب کی بہترین نعت فارسی میں ہیں اور فارسی کا اس ملک میں رواج نہیں رہا۔ دو ایک نمونے ملاحظہ فرمایئے۔ "مہر نیمروز" میں حمد کے بعد "زمزمۂ نعت" کے عنوان سے صفحے کے صفحے لکھتے چلے گئے ہیں۔ اور اتنا کچھ لکھنے پر بھی جی نہیں بھرتا۔ اسی طرح دوسری تصانیف کو بھی بہتر سے بہتر...

نعت لکھ کر زندہ جاوید بنانے کی کوشش کی ہے اور نعت جس جوش کے ساتھ لکھتے ہیں، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کو حضور رسالتمآب سے کیسی والہانہ محبت تھی۔ مثلاً ؎

زراز نہاں پردۂ بر زدہ ۔۔۔ ز ذاتِ خدا بنجرے سر زدہ
تمنائے دیرینۂ کردگار ۔۔۔ بوئے ایزد از خویش امیدوار
تن از نور پالودہ سر چشمہ ۔۔۔ دلے ہمچو مہتاب در چشمہ
جمالش دل افروز روحانیاں ۔۔۔ خیالش نظر سوز یونانیاں
بہ پیوند پیرایۂ خاکیاں ۔۔۔ بہ دم حرز بازوئے افلاکیاں

آبِ حیواں بر رد شناسیٔ خاک راہش زندہ جاوید سازد۔ عیسیٰ بہ ہمدیٔ یادِ دامنش جاں در تنِ مردہ اندازد ...... بہ طرفِ چمنے کہ دراں چمنش بہ محبوبی نشاندہ اند خضر سبزۂ بیگانہ و ہر شمع انجمنے کہ دراں انجمنش بہ مہمانی خواندہ اند آرنی گوئے طورِ پروانہ۔ کوہ کانِ کوشش راز انجم مرغانِ رشتہ بر پا در دست کہ ہموارہ در طیرانند و ہمچناں برجائے مانند۔ اُردو بیش راز افلاک آوستانِ رام راز پیراں پیوستہ بیک ہنجار روند و از خطِ دائرہ بدر نروند۔ پویندگان جادۂ شرعِ عشق را سبزۂ باغِ بہشت چوں سایہ ہمپائے و نخلۂ طوبیٰ چوں خضر پیش رو تاہر قدر براں جادۂ غرض رہروی دادہ باشند لبسایۂ رہ بریدہ باشند و بر سبزہ گام نہادہ ...... پیش از ہمہ خلق از خدا بہ تشریف ہستی نام دار۔ و بعد از خدا بر ہمہ خلق بخداوندی سزاوار۔ ستم زدگاں را بداد و داد رد غم زدگاں را بیاد و ریاد رس۔ آسمانیاں آستانیاں سر و شاں سفتہ گوشاں خاک نشینانِ دراز سپہر برترش، منشور فرمان روائی سلیماں را چناں خوار داشتہ اند کہ پنداری سطرِ نقشِ پائے مور پنداشتہ اند۔ حامانِ عرش را اندوہے کہ در عالم فرضِ محال نیز نشانِ نیست، اگر ہست جز رشکِ طالع جبیں سایانِ سنگِ آستانش نیست ؎

مطاعِ آدم و عالم محمدِ عربی ۔۔۔ وکیلِ مطلق و دستورِ حضرتِ باری

عدو کشے کہ زچاک کنارِ تو قیعش | دو دیدہ تا دلِ خسرو جراحت کاری
شہنشہے کہ دبیرانِ دفترِ جاہش | بہ جبرئیل نویسند عزت آثاری
افادۂ اثر ریش بر قوائم افلاک | بہ شکلِ رعشہ بر اندامِ آدمی طاری
افاضۂ اثر ریش در حقائقِ آفاق | بسانِ روح در اعضائے جانور ساری

" دو نیمہ گشتنِ پیکرِ ماہ در ہفتہ آسمانی حوصلۂ معجزہ خواستاراں بودہ است ورنہ در ہر انگشتِ نیرد ے بیم بر زدن روزگار را بردہ است "......

حضورؐ کے دوسرے معجزات کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ معجزات " از آثارِ بزرگی صورت آں بزرگ معنی و صورت است کہ صورت آشنایان را از بہر مشاہدۂ تجلیاتِ الٰہی در عالمِ صورت ضرورت است ورنہ خواجہؐ را چہ بہ چشمے کہ جز ندارانہ بیند، نتواں دید و چیزیہ دلے کہ جز خدا ۔ نداند، نتواں دانست ۔

ایک نعتیہ غزل اور سن لیجئے ؎

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است | آرے کلامِ حق بزبانِ محمدؐ است
آئینہ دارِ پرتوِ مہر است ماہتاب | شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است
تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است | اما کشاد آں ز کمانِ محمدؐ است
دانی اگر بہ معنیٔ لولاک وارسی | خود ہر چہ از حق است از آنِ محمدؐ است
ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد | سوگندِ کردگار بہ جانِ محمدؐ است
واعظ حدیثِ سایۂ طوبیٰ فرو گزار | کاینجا سخن ز سرو روانِ محمدؐ است
بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را | کاں نیمہ جنبشے ز بنانِ محمدؐ است
ورخود ز نقشِ مہرِ نبوت سخن رود | آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ است

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

غالب کی نظم و نثر سے نعت کے یہ نمونے ظاہر کرتے ہیں کہ غالب کی دوسری شاعرانہ خصوصیات کی طرح اقبال، غالب کی نعت گوئی سے بھی متاثر ہوئے ہیں ۔ نیز

ہمارے دعوے کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ "جاوید نامہ" کی سیر آسمانی میں اقبال کی مرزا غالب سے ملاقات ہوتی ہے تو مرزا کی زبان پر اس وقت بھی یہ ترانہ ہوتا ہے کہ ؎

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست

رحمۃ للعالمینی انتہاست

غالب کے بعد جس شخص کا اثر انھوں نے قبول کیا ہے، وہ خواجہ الطاف حسین حالی ہیں۔ وہی دردِ قوم وہی یادِ ماضی اور عظمتِ رفتہ کے احیاء کی تڑپ، وہی قوم کی پستی اخلاق و زبوں حالی کا رونا اور قوم کے مستقبل کی فکر جو حالی کے ہاں ہے۔ اقبال کے ہاں بھی موجود ہے۔ لہٰذا جہاں اُن کو حالی کی دوسری باتوں نے متاثر کیا ہے۔ وہاں اُن کے عشقِ رسول میں زمزمہ سنجی نے بھی متاثر کیا ہے۔ جلال الدین صاحب بیرسٹر لکھتے ہیں :-

"خواجہ حالی مرحوم کے مسدس کے تو وہ عاشق تھے، میرے پاس ٹونک کا ایک شائستہ مذاق ملازم تھا، اسے ستار بجانے میں خاص دسترس تھی اور وہ مسدس حالی ستار پر ایک خاص طرز کے ساتھ سنایا کرتا۔ ڈاکٹر صاحب التزام کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے دن اُس سے مسدس سننے کی خواہش کرتے، حضور سرورِ کائنات کی تعریف میں وہ بندہ جو "وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا" سے شروع ہوتے ہیں اور وہ اشعار جو مسدس کے آخر میں ہیں (اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے) انھیں بطورِ خاص مرغوب تھے، اُن کے سنتے ہی اُن کا دل بھر آتا اور وہ اکثر بے اختیار رو پڑتے اسی طرح کوئی عمدہ نعت سنائی جاتی تو اُن کی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں" [1]

---

[1] مکاتیبِ اقبال۔

غرضکہ والدین کی تربیت، استاد کی تعلیم اور ماحول کے اثر نے ان کو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشق بنا دیا۔ اور غالبؔ، حالیؔ اور دوسرے شعراء کے نعتیہ کلام نے اس آگ کو اور تیز کر دیا مگر اس وقت تک ان کا عشق بھی اعتقادی تھا اور نعت گوئی کا انداز بھی تقریباً دوسرے نعت گو شعراء جیسا ہی تھا۔ مثلاً اپنی نظم "بلال" میں لکھتے ہیں ؎

گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر
کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر
ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی
نماز اس کے نظارہ کا اک بہانہ بنی
خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اُس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

یا غزل ؎

سراپا حُسن بن جاتا ہے جس کے حُسن کا عاشق
بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں؟
بھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ماعرفنا پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں
نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں

یا ترانۂ ملی ؎

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اگرچہ ان اشعار میں بھی دوسرے شعراء کے مقابلے میں کسی قدر امتیازی شان کی جھلکیاں موجود ہیں۔ جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے ؎

نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں

تاہم زیادہ تر قدیم انداز ہے مگر بعد میں جب ان کا مطالعہ علم وسیع ہوتا گیا اور خصوصاً علوم اسلامیہ کا مطالعہ۔ چنانچہ انہوں نے یورپ کے زمانۂ قیام میں اسلام پر لیکچر دیئے اور اسلامی تعلیم کے فلسفے کا تحقیقی مطالعہ کر کے وہ مقالہ لکھا جس پر اُن کو میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری ملی۔ اس کے ساتھ ہی یورپ کے حالات کو دیکھ کر اُن کے دل میں بیداریٔ قوم اور احیاءِ دین

اسلام کا جذبہ پیدا ہو تو انھوں نے قرآنِ کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارک کا خاص طور پر مطالعہ کیا تاکہ قوم کے سامنے ایک لائحہ عمل رکھ سکیں۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے علوم اور دوسرے مذاہب کو جانچنے اور اُن سے اسلامی تعلیمات کا مقابلہ کرنے کا بھی موقعہ ملا تو اُن کا عشق ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ وہ عشق جو پہلے محض تقلیدی تھا آخر کار حقیقی عشق کی صورت اختیار کر گیا۔ اور اب وہ بقول مولانا عبدالمجید سالک :-

"حضورؐ کی ذاتِ والا کو ساری کائنات سے افضل مانتے تھے اور ہر مسلمان مانتا ہی ہے لیکن تمام مسلمانوں کے ماننے اور اُن کے ماننے میں فرق یہ تھا کہ مسلمان اعتقاداً کہتے ہیں کہ ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

لیکن حضرت علامہ تحقیقاً اس عقیدے کو تسلیم کرتے تھے اور جب اس پر گفتگو کرتے تو القاء، الہام، مقامِ نبوت، انسانیتِ کاملہ، توازنِ جذبہ و ادراک اور حریتِ انسانی کے مسائل پر نفسیاتِ جدید کے رو سے ایسی سیر حاصل بحث فرماتے کہ کسی مخالف کو بھی حضورؐ کے انسانِ کامل ہونے میں شبہ کی گنجائش باقی نہ رہتی۔" [1]

اصل میں اقبال نے یورپ پہنچ کر جب اُس مہذب دُنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اُن کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اُس آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کے

---

[1] اقبال نامہ ص ۴۲

پیچھے فسق و فجور اور معصیت و خدا فراموشی کے وہ اندھیرے ان کو نظر آئے کہ روح کانپ گئی اور مظلوم انسانیت کے لئے آنکھیں خون کے آنسو رونے لگیں۔ بڑی فکر اس بات کی ہوئی کہ آیا یورپ کے زہر کا تریاق ہے بھی یا نہیں۔ کیا دُنیا اسی طرح جہنم کدہ بنی رہے گی۔ کیا انسان اسی طرح انسان کا شکار ہوتا رہے گا۔ اور اس مایوسی اور بے چینی کی حالت میں جب انھوں نے اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا تو انھیں صبح امید کے آثار نظر آنے لگے۔ اور بالآخر ان کے وسیع اور عمیق مطالعے نے اُن پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ ان تمام مصیبتوں کا حل اور ان جملہ امراض کا علاج اسلام میں موجود ہے۔ اب وہ کھلے بندوں اسلام کی خوبیاں اور یورپ کی تہذیب و تعلیم کے نقائص و معائب بیان کرتے ہیں:۔ مثلاً

یہ عیشِ فراواں یہ حکومت یہ تجارت — دل سینۂ بے نور میں محرومِ تسلّی!
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے — یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلّی!

یورپ کی حالت کیا ہے؟ ؎

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات!
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیّت کے فتوحات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

چہروں پہ جو سُرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

یورپ کی سیاست کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

می کند بندِ غلاماں سخت تر — حرّیت می خواند او را بے بصر!
گرمیٔ ہنگامۂ جمہور دید — پردہ بر روئے ملوکیت کشید!
سلطنت را جامعِ اقوام گفت — کارِ خود را پختہ کرد و خام گفت

در فضائش بال و پر نتواں کشود | با کلیدش ہیچ در نتواں کشود
گفت با مرغ قفس اے دردمند! | آشیاں در خانۂ صیاد بند
ہر کہ سازد آشیاں در دشت و مرغ | او نباشد ایمن از شاہین و چرخ
از فسونش مرغ زیرک دانہ مست | نالہ ہا اندر گلوئے خود شکست
حرّیت خواہی بہ پیچاکش میفت | تشنہ میر و بر لبِ تاکش میفت
الحذر از گرمئ گفتار او | الحذر از حرفِ پہلو دار او
چشمہا از سرمہ اش بے نور تر | بندۂ مجبور ازو مجبور تر!
از شرابِ ساتگینش الحذر | از قمارِ بد نشینش الحذر

یہ سیاست غلاموں کی قید کو اور سخت کرتی ہے اور اس کا کمال یہ ہے کہ یہ کم عقل اس کو آزادی سمجھتے ہیں۔ ہنگامۂ جمہوریت کی شورا شوری بھی دیکھ لی۔ ملوکیت کے چہرے پر جمہوریت کا نقاب ڈالا گیا ہے! اس سیاست کی ہوا میں پر نہیں کھولنے چاہئیں۔ اس سے کوئی مشکل آسان نہیں ہو سکتی۔ پرندے سے کہتی ہے غم نصیب! صیاد کے گھر میں آشیانہ بنا۔ جو کوئی دشتِ چمن میں آشیانہ بناتا ہے، شاہین و عقاب سے محفوظ نہیں رہتا۔ اس کے افسوں سے مرغِ زیرک دانہ مست ہو کر نالہ کرنا بھول جاتا ہے۔ اگر تو حرّیت چاہتا ہے تو اس کے دام پر پیچ میں نہ پڑ۔ پیاسا مرجانا پسند کر مگر اس کے انگوروں سے دُور رہ۔ اس کی گرمئ رفتار اور حرفِ پہلو دار سے خدا کی پناہ! آنکھیں اس کے سرمہ سے اور بھی بے نور ہیں اور بندۂ مجبور اس کے ہاتھوں اور بھی زیادہ مجبور ہے ؎

مغربی تہذیب کیا ہے؟

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب | کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف!
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید | ضمیر پاک و خیالِ بلند ذوقِ لطیف!

یورپ کی معاشرت ؎

کوئی پوچھے حکیم مغرب سے | ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش

کیا یہی ہے معاشرے کا کمال؟ | مرد بیکار و زن تہی آغوش

حکمتِ فرنگ ؎

تفریق ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود | اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم

ایک جگہ اسلامی تعلیمات کی تعریف کرنے کے بعد فرماتے ہیں ؎

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست | چشمِ او ینظر بنور اللہ نیست
او نداند از حلال و از حرام | حکمتش خام و کارش ناتمام
اُمتے بر اُمتے دیگر چرد | دانہ ایں می کارد آں حاصل برد
از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است | از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است
شیوۂ تہذیب نو آدم دری است | پردۂ آدم دری سوداگری است
ایں بنوک ایں فکرِ چالاکِ یہود | نورِ حق از سینۂ آدم ربود
تا تہ و بالا نگردد ایں نظام | دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

افسوس یورپ اس مقام سے آگاہ نہیں ہے۔ اس کی آنکھ اللہ کے نور سے نہیں دیکھتی۔ حلال و حرام کا فرق نہیں جانتا۔ اس کی حکمت خام ہے اور اس کا کام ناتمام۔ ایک قوم دوسری قوم کو کھا رہی ہے۔ ایک بوتا ہے اور دوسرا اس کے حاصل کو اڑا لیتا ہے۔ یورپ کے نزدیک کمزوروں کی روٹی چھین لینا ایک طرف، ان کے جسم سے جان تک نکال لینا حکمت ہے۔ غرضکہ تہذیبِ نو کا شیوہ آدم دری ہے اور آدم دری کا پردہ تجارت کو بنایا ہے۔ ان بینکوں نے جو یہود کی فکرِ چالاک کا مظہر ہیں۔ آدمی کے دل سے نور چھین لیا ہے۔ جب تک یہ نظام تہ و بالا نہ ہوگا دانش و تہذیب سودائے خام رہے گی۔

یورپ کی عورت ؎

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت | ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت!
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن | کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن | ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

غرضکہ رنگ ونسل کے امتیازات، گورے کالے کا فرق، وطنیت وقومیت کے بتوں کی خوں آشامیاں، مساوات واخوت کا فقدان، انسان کی انسان کے ساتھ بدترین دشمنی، سود خوری، نفع اندوزی، لوٹ کھسوٹ، آپا دھاپی، اسی دُنیا کو مآلِ مقصود بالذات سمجھنا، حیات بعدالموت سے انکار، تن کی فکری روح سے غفلت، ہمدردی، ایثار، مروّت اور غمخواری سے بے تعلقی، عورت کی آزادی، یہ اور اسی قسم کی بے شمار انفرادی واجتماعی خرابیاں۔ یورپ کی تہذیب اور اس کی معاشرت میں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اور اس سے پہلے خود اپنے ملک میں ہندو، بدھ، جین اور دوسری اقوام کے حالات کا اچھی طرح مشاہدہ کر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی جب اسلامی تعلیمات پر غور کیا تو معاملہ کچھ اور ہی نظر آیا۔ اسلام کے ہمہ گیر، جامع اور غیر فانی اصولِ مساوات، حُرّیت، اخوت اور اس کا سیاسی ومعاشی نظام، اس کی تہذیب، تمدن اور عمرانی زندگی کے اصول اور پھر صدرِ اسلام کے مسلمانوں کی زندگی اور پاکیزہ وبے عیب معاشرہ ان کی نگاہوں کے سامنے آیا تو اُن کو یقین ہو گیا کہ اسلام ہی کے اصول پر عمل پیرا ہونے میں دنیا کی نجات ہے۔ یہی نظامِ زندگی دُنیا کے لئے دارالامان کا حکم رکھتا ہے۔

چنانچہ انھوں نے اپنے مطالعۂ علمی اور مشاہدۂ عینی کے تاثرات کو سب سے پہلے دو مثنویوں "اسرارِ خودی" و "رموزِ بیخودی" کے ذریعے دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ دنیا کے لئے یہ ایک چیلنج بھی تھا اور دعوتِ عمل بھی تھی۔ چیلنج اس طرح کہ اگر اس سے بہتر دستورِ حیات کسی کے پاس ہے تو اُس کو پیش کیا جائے۔ اور دعوتِ عمل اس لئے کہ اگر اس سے بہتر دستور العمل نہیں ہے تو نوعِ انسانی کی فلاح وبہبود کی خاطر اس کو قبول کیا جائے اور اس طرح موجودہ خلفشار کو دور کر کے دنیا کو امن وسلامتی اور خوش حالی سے دوچار ہونے کا موقع دیا جائے، اسی کے ساتھ ہی اپنی قوم کو بھی یاد دلایا ہے کہ وہ اس نسخۂ کیمیا کو جس نے مسِ خام کو کندن بنا کر دکھایا تھا، طاقِ نسیاں سے اُتار کر اپنی زندگی کو پھر اُس کے ذریعے آراستہ کرے۔!

اسلام نے افراد کو جماعت کا بہترین رُکن بننے کے لئے جو ہدایات دی ہیں ان کو اقبال نے "اسرار خودی" میں بیان کیا ہے۔ اپنے آپ کو پہچاننا، بلند مقاصد کی تولید اور اُن کے حصول کی جدوجہد کے ذریعہ مصروفِ عمل رہنا۔ نفیٔ خودی، ترکِ آرزو اور زندگی کی دشواریوں سے فرار اختیار کرنے کو مذموم اور حلال کو حرام سمجھنا اس سے خودی ضعیف ہوتی ہے، خودی کو عشق کے ذریعہ محکم بنانا تاکہ وہ نظامِ عالم کے قوی مخفیہ وظاہرہ کو مسخر کر سکے۔ تربیتِ خودی کے لئے اطاعتِ قانونِ الٰہی اور ضبطِ نفس کا مکمل نصاب یعنی کلمۂ طیبہ کی حقیقت کا سمجھنا، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا سختی سے پابند ہونا کہ ان میں ہزاروں حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اس کے بعد نیابتِ الٰہی کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا کہ یہ انسانیت کی معراج ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اعلاءِ کلمۃ الحق قرار دینا اور اس بلند اور پاکیزہ مقصد کے تحفظ اور بقا کے لئے جہاد کرنا اور جہاد کے علاوہ ہر قسم کی جنگوں کو حرام قرار دے دینا۔ ارکانِ اسلام کی پابندی کے ذریعے وقت کی قدر، نظم وضبط اور توجہ الی اللہ اور اطمینانِ دل کا بہترین سبق دینا وغیرہ۔

اجتماعی و ملی زندگی کے متعلق اسلام کی برکات کو "رموزِ بیخودی" کے ذریعہ بیان کر کے اسلام کے بتائے ہوئے آئین کو حیاتِ ملی کے لئے بہترین ضابطہ قرار دیا ہے اور اس ضمن میں مختلف اسلامی اصولوں پر تبصرہ کر کے اپنے پیش کردہ نظریہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں۔ اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان مثنویوں کے ذریعہ حقیقی اسلام کو بے نقاب کردوں،

جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے ہوئی۔" لہ

اسلام نے فرد و ملت کے ربطِ باہم پر کس قدر زور دیا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے "شیطان جماعت سے دُور رہتا ہے" ؎

حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشرؐ | ہست شیطاں از جماعت دُور تر

اور جس طرح جماعت فرد کے بغیر وجود میں نہیں آتی، فرد بھی جماعت کے بغیر زندہ و پائندہ نہیں ہو سکتا دونوں لازم و ملزوم ہیں، اور ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔ فرد کی عزت قوم سے ہے اور ملت کا نظام افراد سے ہے۔ فرد جماعت میں مل کر قطرۂ ناچیز سے قلزم بیکراں ہو جاتا ہے۔ جب تک تنہا ہے مقاصد سے غافل ہے اور اس کی قوتیں منتشر ہیں۔ جب قوم سے وابستہ ہو جاتا ہے تو قوم اُس کو ضبط و نظم سے آشنا کر کے ہر طرح کی غلامی سے آزاد کر دیتی ہے۔ حلقۂ آئینِ جماعت میں گرفتار ہو کر خوئے رم چھوڑ دیتا ہے اور اپنے ہی حُسن و جمال کا اسیر، اپنے ہی اصول و روایات پر فریفتہ اور اپنے ہی نظریات کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔ دوسروں کی اداؤں پر دل کو فدا کرنے کی بجائے قوم کے آئینہ میں اپنی ادا دیکھتا ہے اور اپنا ہی عاشق ہوتا ہے۔

اسلام نے فرد کو اعلیٰ مقاصد کے لئے جماعت میں گم ہونے کی تعلیم دی ہے۔ اور فرد کی خودی اور اس کی تربیت و استحکام کی غرض و غایت ہی یہ بتلائی ہے کہ ایک بہترین جماعت وجود میں آئے جو

لہ مکاتیبِ اقبال۔ صفحہ ۲۲

"کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ" کا مصداق ہو۔ فرد جماعت میں مل کر قطرہ سے دریا اور برگِ گل سے چمن ہو جاتا ہے تو جماعت بھی ایسے افراد کی بدولت جو اپنی تمام انفرادی و شخصی صلاحیتوں کے ساتھ جماعت میں داخل ہوتے ہیں، محکم اور قوی ہوتی ہے ؎

در جماعت خود شکن گردد خودی تا ز گلبرگے چمن گردد خودی
فرد تا اندر جماعت گم شود قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

اور جماعت میں مل کر افراد کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ؎

مردماں خوگر بیک دیگر شوند سفتہ در یک رشتہ چوں گوہر شوند
در نبردِ زندگی یارِ ہم اند مثلِ ہمکاراں گرفتارِ ہم اند
محفلِ انجم ز جذبِ باہم است ہستی کوکب ز کوکب محکم است

جماعت کا قیام تو اختلاطِ افراد سے ظہور پذیر ہو جاتا ہے مگر اس کی تعمیر و تکمیل کسی زندہ عقیدے یا قانون کے ذریعے مربوط ہو کر ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے ملّتِ اسلامیہ کی تکمیل، تربیتِ نبوت کے ذریعہ ہوئی ہے۔

اسلام نے توحید و رسالت پر ایمان کی بنیاد رکھی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کا دامن چھوٹا اور ایمان کی عمارت زمین پر آ رہی۔ توحید کے ذریعہ انسان تمام مکروہات سے محفوظ رہتا ہے۔ مایوسی اور حزن و ملال کیوں کر باقی رہ سکتا ہے۔ جبکہ یقین ہو جائے کہ ایک ایسی ہستی موجود ہے جس سے غلطی، سہو، یا زیادتی سرزد نہیں ہوتی۔ جو سمیع و بصیر بھی ہے اور ہمہ داں و قادرِ مطلق بھی۔ اور جب تک ہم اس سے وابستہ ہیں ناکامی و نامرادی کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا اور ہماری کوششوں کا ثمرہ مل کر رہے گا۔ اقبالؔ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزو ست زندگانی محکم از لَا تَقْنَطُوْا ست

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر
از نبیؐ تعلیم لَا تَحْزَنْ بگیر

چوں کلیمے سوئے فرعونے رود
قلب او از لَا تَخَفْ محکم شود

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ اور لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا سے اہلِ توحید کو تقویت وطمانیتِ خاطر حاصل ہوتی ہے جو پرستارانِ توحید ہیں ورنہ حزن و ملال، مایوسی اور خوف کا علاج مشکل ہے۔ اس لئے اقبال فرماتے ہیں۔ ؎

ہر کہ رمزِ مصطفیٰؐ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

رسالت کے ذریعے اسلام نے اُن تمام نظریات اور اصول کے ممکن العمل ہونے کو بھی ثابت کیا جو اس نے پیش کئے تھے اور نوعِ انسانی کے لئے باعثِ خیر و برکت ہونے کو بھی۔ اس لئے کہ اسلام کے رسولؐ نے ان پر خود عمل کر کے دکھلایا اور اُن اصولوں کے ذریعے ہی آپ کی زندگی ہی میں ایک ایسا معاشرہ قائم ہو گیا کہ چشمِ فلک نے نہ ایسا کبھی پہلے دیکھا اور نہ آئندہ دیکھ سکے گی۔ اقبالؒ نے ذیل کے اشعار میں اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

تمدن آفریں، خلّاقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا

سماں "الفقر فخری" کا رہا شانِ امارت میں
"بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را"

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

غرض میں کیا کہوں تم سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے!
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

یہ معاشرہ اسلام کے انفرادی و اجتماعی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی و روحانی اصولوں پر قائم ہوا تھا اور انسان کے لئے سراپا رحمت و رافت اور فلاح و برکت ثابت ہوا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ جانشینانِ رسول اللہؐ نے اپنی زندگیوں کو حضورؐ کے اسوۂ پاک کے سانچہ میں ڈھال کے دنیا کا نقشہ بدلا تھا۔ جب تک کسی نظریے کے پیچھے زندہ و پائندہ شخصیت کارفرما نہ ہو وہ نظریہ تاریخ کے صفحات کی زینت تو ہو سکتا ہے مگر دنیا میں انقلاب نہیں لا سکتا۔ اور کوئی زندہ و پائندہ سوسائٹی محض نظریات و اصول کے ذریعے قائم نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ نظریات عمل کے ذریعہ افراد کے کردار و گفتار میں متشکل ہو کر اپنی نفع بخشی ثابت نہ کر دیں۔ نیز حضور رسالتمآبؐ نے دنیا کے سامنے جو دستور العمل رکھا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حریت، مساوات اور اخوتِ نوعِ انسانی کی بنیاد رسالتِ محمدیہ کے ذریعہ ہی رکھی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ عالم انسانی کی فلاح و بہبود ان حقائقِ سہ گانہ کی تشکیل و تعمیم ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ان ہی صفاتِ مذکورہ کی وجہ سے اسلام زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

پس خدا برما شریعت ختم کرد — بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را — او رسل را ختم و ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت — داد ما را آخریں جامے کہ داشت
لانبی بعدی ز احسانِ خدا ست — پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰ است

اسی حریت، مساوات اور اخوت کی بنا پر اسلام کے اصولوں پر قائم ہونے والی سوسائٹی جغرافیائی حدود سے آزاد ہو کر ساری دنیا کو اپنے ساتھ ملانے کو اپنا مقصدِ حیات سمجھتی ہے۔ اس لئے کہ اسلام ساری دنیا کے لئے پیغامِ امن و راحت بن کر آیا ہے نہ کہ محض مسلمانوں کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں اسلام کے

خدا کو ربّ العالمین، رسولؐ کو رحمۃ العالمین کے لقب سے یاد کیا ہے وہاں اپنے آپ کو بھی "ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ" کہا ہے۔ یہیں سے یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ جب ملتِ اسلامیہ اپنے اصول اور تعلیمات کی جامعیت و ہمہ گیری کی وجہ سے زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ تو اس کے نزدیک رنگ و نسل اور ملک و وطن کے امتیازات بھی کیونکر پیدا ہو سکتے۔ اقبالؔ فرماتے ہیں ؎

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست
رومی و شامی گِلِ اندامِ ماست

قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بوم او بجز اسلام نیست

می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم
در دلِ او یاوہ گردد شام و روم

اسی طرح قیدِ زماں سے آزاد ہونے کے متعلق فرماتے ہیں ؎

امتِ مسلم ز آیاتِ خدا ست
اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ است

از اجل ایں قوم بے پرواستے
استوار از نحن نزّلنا ستے

ذکر قائم از قیامِ ذاکر است
از دوامِ او دوامِ ذاکر است

تا خدا ان یطفئوا فرمودہ است
از فسردن ایں چراغ آسودہ است

خدا فرماتا ہے "نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" ط ہم نے ذکر ہی ذکر (قرآن) نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ضامن ہیں۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ ذکر کی حفاظت سے ذاکر کی حفاظت لازم آتی ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ مسلمان نہ ہوں اور قرآنِ کریم ہو۔ قرآنِ کریم ہے تو مسلمان بھی ہیں۔

اسی طرح ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْکٰفِرُوْنَ ط
چاہتے ہیں بجھا دیں اللہ کی روشنی اپنے منہ (پھونکوں) سے اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کرے گا، خواہ کافر برا مانا کریں۔

یعنی جب اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کا چراغ کفّار اپنی پھونکوں سے نہیں بجھا سکیں گے تو پھر اس چراغ کے بجھنے کا اندیشہ کس کو ہو سکتا ہے! اور یہ حفاظت بے وجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ صرف یہی اُمّت ہے جو تخلیقِ عالم کے مقصد کو پورا کر سکتی ہے ؎

اُمّتے در حق پرستے کاملے — اُمّتے محبوب ہر صاحب دلے
حق بروں آورد ایں تیغِ اصیل — از نیامِ آرزو ہائے خلیل
تا صداقت زندہ گردد از دمش — غیرِ حق سوزد ز برقِ پیہمش
ما کہ توحیدِ خدا را حجتیم — حافظِ رمزِ کتاب و حکمتیم

ملّت کی شیرازہ بندی کے لئے آئین بھی ضروری ہے۔ اور ایک ایسی ملّت کے لئے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، یعنی جو آخری اُمّت ہے اور قیامت تک کے لئے نوعِ انسانی کے لئے بشیر و نذیر بن کر آئی ہے، آئین بھی ایسا ہی جامع، ہمہ گیر اور لازوال ہے جو انسان کے ہر شعبۂ حیات کے لئے مکمّل ہدایات کا حامل ہے اور ہر جگہ اور ہر زمانے میں یکساں رہنمائی کرتا ہے۔ اقبالؔ فرماتے ہیں ؎

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟ — زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوّتش گیرد ثبات
حرف او را ریب نے تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
پختہ تر سودائے خام از زورِ او — در فتد با سنگِ جام از زورِ او
می برد پابند و آزاد آورد — صید بنداں را بہ فریاد آورد
نوعِ انساں را پیامِ آخریں — حاملِ او رحمۃ اللعالمین
رہزناں از حفظِ او رہبر شدند — از کتابِ صاحبِ دفتر شدند
دشت پیمایاں ز تابِ یک چراغ — صد تجلّی از علوم اندر دماغ!

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست — نقش ہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں — زندہ و پائندہ و گویاست ایں
اندرو تقدیرہائے غرب و شرق
سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق

تو جانتا ہے تیرا آئین یعنی اس آسمان کے نیچے تیری عزت کا راز کیا ہے؟ وہ زندہ کتاب جو قرآنِ حکیم ہے، جس کی حکمت لازوال اور قدیم ہے، جو حیاتِ انسانی کے لئے نسخۂ اسرار ہے، جس کی قوت سے ناپائدار پائدار ہو جاتا ہے، جس کا حرف حرف ریب و تبدل سے محفوظ ہے۔ جس کی آیات شرمندۂ تاویل نہیں ہیں، جس کے زور سے جام پتھر سے لڑ جاتا ہے، غلام جس کے پاس آتے ہیں تو آزاد ہو کر جاتے ہیں۔ جس سے ظالم نالاں ہیں، جو نوعِ انسانی کے لئے خدا کا آخری پیغام ہے، جس کا حامل رحمۃ اللعالمین ہے، جس کی بدولت رہزن رہبر بن گئے۔ اور وحشیوں نے اس ایک چراغ کی روشنی سے علوم کی سینکڑوں تجلی اپنے دماغ میں بھر لیں۔

قرآن مجید کیا ہے؟ خواجہ کے لئے پیغامِ مرگ اور بندۂ بے نوا کا دستگیر جب قرآنِ کریم کا نقش اس عالم میں قائم ہوا تو کاہن و پاپا کے نقوش باطل ہو گئے جو دل میں ہے۔ برملا کہتا ہوں کہ یہ کتاب نہیں ہے اور ہی کوئی چیز ہے۔ دل میں اترتا ہے تو دل کی حالت بدل جاتی ہے۔ اور جب دل بدل جاتا ہے۔ تو جہاں بھی بدل جاتا ہے۔ یہ خدا کی طرح عیاں بھی ہے۔ اور نہاں بھی، زندہ و پائندہ اور گویا بھی۔ اس میں مغرب کی تقدیر بھی پوشیدہ ہے۔ اور مشرق کی بھی۔ اور انسان کے خیال میں برق کی سرعت پیدا کرتا ہے۔

حیاتِ ملّی کی شیرازہ بندی و استحکام کے لیۓ ایک مرکزِ محسوس بھی ضروری ہے۔ اور ایسی ملّت کے لیۓ جو وحدتِ مقصد اور وحدتِ نصب العین میں یکتا و یگانہ ہے۔ مرکز بھی ایک ہی ہے۔ اور ایسی بلند روایات کا حامل ہے جو اس ملّت کے شایانِ شان ہیں۔ یعنی "بیت الحرام" جو توحید کا سرچشمہ اور ملّتِ ابراہیمیؑ کی جائے ولادت ہے۔ اقبالؔ اس مرکز کی تعریف کرتے ہیں ؎

قوم را ربط و نظام از مرکزے | روزگارش را دوام از مرکزے
راز دار و راز ما بیت الحرام | سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام
از حسابِ او یکی بسیار ریت | پختہ از بندِ یکی خود داریت
تو ز پیوند حرمے زندۂ! | تا طوافِ او کنی پائندہ ؎

در جہاں جانِ اُمم جمعیت است | در نگر سرِ حرم جمعیت است

اسی طرح ملّتِ اسلامیہ کا نصب العین بھی ایک ہے، وحدتِ نصب العین میں اس کی بقا کا راز پوشیدہ ہے۔ اس کی تبلیغ سے ملّت کی رگوں میں زندگی کا خون رواں ہے۔ اگر وحدتِ مقصد نہ ہو تو افراد میں ربطِ حقیقی نہیں پیدا ہو سکتا۔ اور ربطِ حقیقی کے بغیر ہجومِ افراد تو ہو سکتا ہے، ملّت نہیں ہو سکتی۔ اور جب کہ نصب العین ایک اور اتنا بلند ہے۔ یعنی "حفظ و نشرِ توحید" تو ایسی ہی جماعت دنیا میں حقیقی جمعیت سے بہرہ ور ہو سکتی ہے۔ اقبالؔ اوّل مطلق مدعا کی تعریف کرتے ہیں ؎

مدعا رازِ بقائے زندگی | جمع سیمابِ قوائے زندگی
چوں حیات از مقصدے محرم شود | ضابطِ اسبابِ ایں عالم شود
مدعا مضرابِ سازِ ہمت است | مرکزے کو جاذبِ ہر قوت است

دست و پائے قوم را جنبانداد　　یک نظر صد چشم را گرداند اد

اس کے بعد ملتِ اسلامیہ کے مدعا و مقصد کی تعریف کرتے ہیں ؎

نقطۂ اُدوارِ عالم لا الٰہ　　انتہائے کارِ عالم لا الٰہ

چرخ را از زورِ او گردندگی　　مہر را تابندگی رخشندگی

صد نوا داری چوں خوں در تن رواں　　خیز و مضرابے بتارِ او رساں

زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست　　حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست

اسلام نے توسیعِ حیاتِ ملی کے لئے موجوداتِ فطرت کی تسخیر پر زور دیا ہے قرآنِ کریم میں انسان کے علوِ مرتبہ کو بیان کرتے ہوئے جا بجا ارشاد ہوا ہے کہ چاند تارے، سورج، پہاڑ، دریا، برق و باراں، انسان کے لئے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔ اور انسان کو وہ صلاحیتیں دے دی گئی ہیں کہ اُن سے کام لے کر وہ ہر چیز کو تسخیر کر سکتا ہے۔ اور یہ بات اسلام نے اس وقت کہی کہ جب دنیا قوائے فطرت کی تسخیر کی بجائے اُن کی پرستش میں لگی ہوئی تھی۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی آرام پسند زندگی سے اگر اس حقیقت کا ثبوت نہیں ملتا کہ اس قوم نے قرآن کریم کے حکم کی تعمیل میں کبھی تسخیر موجودات کی ہو گی تو قرآنِ کریم کی اصل تعلیم اور تاریخ کے حقائق سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے۔۔

بقولِ اقبالؔ، اسلام تو یہاں تک کہتا ہے کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں　　ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر　　چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا　　ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اور یہ تسخیر کسی مادی منفعت، آسائشِ تن اور نفسانی کامرانی کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ اس سے معرفتِ خودی اور عرفانِ الٰہی وابستہ ہے ؎

ہستی حاضر کند تفسیرِ غیب　　می شود دیباچۂ تسخیرِ غیب

ماسوا از بہرِ تسخیر است و بس | سینۂ اُو عرضۂ تیر است و بس
از کنِ حق ماسوا شد آشکار | تا شود پیکانِ تو سنداں گزار
رشتہ باید گرہ اندر گرہ | تا شود لطفِ کشودن را فرہ

کوہ و صحرا، دشت و دریا بحر و بر | تختۂ تعلیم اربابِ نظر
اے کہ از تاثیرِ افیوں خفتۂ | عالمِ اسباب را دوں گفتۂ
خیز و وا کن دیدۂ مخمور را | دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را
غایتش توسیعِ ذاتِ مسلم است | امتحانِ ممکناتِ مسلم است
گیر او را تا نگیرد او ترا
ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا
ثابت و سیارۂ گردوں وطن | آں خداوندانِ اقوامِ کہن
ایں ہمہ اے خواجہ آغوشِ تواند | پیش خیز و حلقہ در گوشِ تواند
جستجو را محکم از تدبیر کن | انفس و آفاق را تسخیر کن
تو کہ مقصودِ خطابِ انظری | پس چرا ایں راہ چوں کوراں بری

آج مہذب دنیا کے رہنے والے اور ان کی دیکھا دیکھی مغرب زدہ مسلمان بھی اسلام کو ہدفِ طعن بناتے ہیں کہ عورت کو اسلام نے آزادی کی نعمت سے محروم رکھا ہے۔ اور سوسائٹی میں اس کو کوئی درجہ نہیں دیا ہے مگر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جس چیز کے سبب اسلام کو خصوصیت سے دوسرے مذاہب پر تفوّق حاصل ہوا اُسی پر اُس کو مطعون کیا جائے! یورپ کے لئے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ع

ہر بچشمِ عداوت بزرگ تر عیبے ست

مگر اپنے بھائیوں کی خیرہ چشمی و کور باطنی کا کیا علاج!

کہنا پڑتا ہے کہ ع

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست!

اسلام نے عورت کا مقام بھی متعین کیا ہے اور اس کی حدودِ عمل بھی متعین کی ہیں۔ اور سوسائٹی میں اس کو اتنا اونچا مقام دیا ہے کہ آج تک کسی مذہب نے نہیں دیا۔ عورت کو بالکل آزاد چھوڑ کر فلم ایکٹریس، رونقِ محفل، اور بیسوا بنا دینا عورت کو عزت بخشنا نہیں ہے بلکہ اس کو ذلت کے تحت الثریٰ میں پہنچا دینا ہے۔ اس لئے اسلام نے عورت کو ایسی عزت سے یقیناً نہیں نوازا ہے۔ نیز عورت کو عورت ہی رکھا ہے۔ مرد بننے کی بھی اجازت نہیں دی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

پوششِ عریانیٔ مرداں زن است　　حُسنِ دلجو عشق را پیراہن است

یہ قرآن ہی کے ارشاد ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ کا ترجمہ ہے۔ عورتیں مردوں کا لباس ہیں۔ مردوں کے بے شمار عیبوں کا پردہ عورتوں ہی سے رہتا ہے۔

آنکہ ناز د بر وجودش کائنات　　ذکر او فرمود با طیب و صلوٰۃ

یہ حضورؐ کی حدیث مبارک کی طرف اشارہ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے میں تمہاری دنیا میں سے نماز، خوشبو، اور عورت کو محبوب رکھتا ہوں۔ غور کیجئے حضورؐ کے اس ارشاد سے عورت کا مقام کتنا بلند ہو جاتا ہے ؎

مسلمے کو را پرستارے شمرد　　بہرۂ از حکمت قرآں نبرد

اقبالؔ کہتے ہیں کہ جو مسلمان، عورت کو کنیز سمجھتا ہے وہ حکمتِ قرآنی سے بہرہ نہیں رکھتا ؎

ملّت از تکریم ارحام است و بس　　ورنہ کارِ زندگی خام است و بس

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ○

اور جس صلۂ رحمی کا اللہ نے حکم دیا ہے اُس کو توڑتے ہیں۔ اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خسارے میں ہیں ؎

حافظِ رمزِ اخوت مادراں　　قوتِ قرآں و ملت مادراں
گفت آں مقصودِ حرفِ کُن فکاں　　زیرِ پائے اُمّہات آمد جناں

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جنت ماں کے پیروں تلے ہے۔ اَلْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ أُمَّهَاتِكُمْ ○

اقبالؔ نے اسلام کی اس زندہ تعلیم کو زندہ عملی صورت میں حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حیاتِ طیبہ میں دیکھا ہے۔ اس لئے خواتینِ اسلام کو اس اُسوۂ حسنہ کے اتباع کی طرف متوجہ کرتے ہیں ؎

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ
مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ

اسرارِ خودی اور رموزِ بےخودی کے بعد اقبالؔ نے اپنی ہر تصنیف میں اسلام کے اصول و نظریات ہی کے نئے نئے پیرایوں میں تعریف و تشریح کی ہے۔ مثلاً

اسلام نے جنگ کا کیا معیار مقرر کیا ہے؟

شہادت ہے مطلوب مقصودِ مومن　　نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

نماز کیا ہے؟

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے　　ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

مومن کی شان کیا ہے؟

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم　　رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش　　خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن!
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں　　جبریلؑ و اسرافیل کا صیاد ہے مومن!

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن!　　گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان!
قہّاری و جبّاری و قدوسی و جبروت　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریل امین، بندۂ خاکی　　ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن　　قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے　　دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم　　دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کے سرود ازلی اس کے شب و روز　　آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمان
تقدیر کے پابند جمادات، نباتات　　مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

ایک جگہ مومن سے خطاب کرتے ہیں ؎

افرنگ زخود بے خبرت کرد وگرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری!

کافر و مومن کا فرق بتاتے ہیں ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق
کافر ہو تو تلوار پہ کرتا ہے بھروسہ　　مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

غرضکہ اب ان کو یقین کامل ہو گیا کہ اسلام کے سوا دنیا میں کوئی دوسرا نظام انسان کی فلاح و بہبود کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ صرف اسلام ایسا مذہب ہے

جو مکمل ضابطۂ حیات رکھتا ہے۔ ایسا ضابطہ جو زماں و مکان کی قیود سے آزاد ہو کر پوری نوعِ انسانی کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس انکشافِ حقیقت سے اُن کو اسلام کے ساتھ والہانہ گرویدگی پیدا ہو گئی اور اسی گرویدگی نے ترقی کر کے پیغمبرِ اسلام کے عشق کی صورت اختیار کر لی۔ اور یہ ایسا عشق تھا جس کی بنیاد سالہاسال کی تلاش و جستجو اور تحقیق پر ہے۔ اس یقین کے بعد ان کی صرف ایک خواہش تھی وہ یہ کہ اسلام کے اصول کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو۔ اُن کو ایک گھر میں نہیں بلکہ ایک ایک شخص تک پہنچایا جائے۔ اور کام کو وہ نوعِ انسانی کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے تھے۔ اسی لئے چاہتے تھے کہ ایک ایسا "اسلامی دارالاشاعت" قائم ہو جو اسلامی فلسفہ و تعلیم کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچائے۔ ایک ایسی لائبریری ہو جہاں مذہب کے متعلق تمام ضروری کتابیں موجود ہوں اور ایک ایسا ادارہ ہو جس کے ذریعہ علومِ اسلامی کا احیا کیا جا سکے۔ ان کے خطوط سے جو انہوں نے اپنے احباب اور عقیدت مندوں کو لکھے ہیں اور اُن کے احباب کی شہادتوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ بعض تحریرات کے ضروری اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

ایک خط حضرت علامہ مصطفےٰ المراغی شیخ جامعہ ازہر کے نام عربی میں لکھا ہے۔ جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے کسی گاؤں میں ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں وقوع میں نہیں آئی۔ ہماری خواہش ہے کہ اس ادارے کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے دینی اور اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کے ہو۔ ہمارا یہ بھی ارادہ ہے کہ علومِ جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور

چند علوم دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجہ کی ذہنی صلاحیتیں موجود ہوں۔ اور جو اپنی زندگیاں دین اسلام کی خدمت کے لیے وقف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ہم ان کے لئے تہذیبِ حاضرہ کے شور و شغب سے دور ایک گوشے میں ہوسٹل بنانا چاہتے ہیں۔ جو ان کے لئے ایک علمی اسلامی مرکز ہو۔ اور اُن کے لئے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر قسم کی جدید و قدیم کتاب موجود ہو اور اُن کی رہنمائی کے لئے ایک ایسا معلم مقرر کرنا چاہتے ہیں جو کامل و صالح ہو اور قرآنِ حکیم میں بصیرتِ تامہ رکھتا ہو اور ... انقلاب دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوح سے واقف کرے اور تفکّرِ اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں بھی ان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے علم اور تحریرات کے ذریعہ تمدّنِ اسلام کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کرسکیں" [1]

ایک خط میں مولانا سید سلیمان ندوی رح کو لکھتے ہیں۔

"میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے، ذاتی لحاظ سے خدا کے فضل و کرم سے میرا دل پورا مطمئن ہے، یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار کرے۔ حال میں ایک تعلیم یافتہ عرب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ فرانسیسی خوب

[1] مکاتیبِ اقبال صفحہ ۱۵۴

جانتا تھا مگر اسلام سے بالکل بے خبر تھا۔ اس قسم کے واقعات مشاہدے میں آتے ہیں تو سخت تکلیف ہوتی ہے" ؎۱

ایک دوسرے خط میں سیّد صاحب کو لکھتے ہیں :۔

"اس وقت بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ فلسفۂ اسلامی کی ایک مفصّل تاریخ لکھی جائے اگر مولانا شبلیؒ زندہ ہوتے تو میں اُن سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں سوائے آپکے اس کام کو کون کرے گا۔ ہندوستان کی جمیعتہ العلماءٔ کی توجہ اس طرف ضروری ہے۔ آپ چونکہ اس جمیعتہ کے صدر ہیں اس واسطے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کام کو مستقل طور پر اپنے ہاتھ میں لیجئے۔ ندوہ کے دیگر ارکان یا فارغ التحصیل طلباءٔ کو بھی اپنے ساتھ ملائیے تاکہ اقوام اسلامیہ کو فقہ اسلامی کی حقیقت معلوم ہو" ؎۲

مسٹر نیاز احمد صاحب ایم۔ اے (دہلی) کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"میرے خیال میں آپ کا اوّلین فرض یہ ہے کہ آپ کو اسلام' اس کی مذہبی اور سیاسی تاریخ' اس کے کلچر اور اس بحران کا۔ مطالعہ کرنا چاہیئے جو ٹرکی اور دوسرے اسلامی ممالک میں مغرب کے افکارِ جدید کے اسلامی زندگی اور افکار پر اثر نے پیدا کر دیا ہے۔ آپ عیسائیوں سے زیادہ اسلام پر کتابیں لکھ کر اسلام کی خدمت کر سکتے ہیں۔ اسلام میں تنخواہ دار مبلغین کی انجمنیں کبھی نہیں تھیں۔ تبلیغ کا کام انفرادی کوشش اور سرگرمی پر

؎۱ مکاتب اقبالؒ صفحہ ۱۵۵ ؎۲ مکاتب اقبالؒ ۱۴۲

موقوف رہا ہے۔ افریقہ کا حلقہ بگوشِ اسلام ہونا ایسے مسلمانوں کی انفرادی کوشش کا مرہونِ منت ہے جن کے پاس اس خلد کے ظاہری وسائل موجود نہ تھے۔ ہندوستان میں بھی اشاعتِ اسلام کا کام شخصی اور انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہے،،[۱]

حافظ محمد فضل الرحمٰن انصاری کو لکھتے ہیں۔

"جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے فرانس، جرمنی اور انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں، جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاقِ حق کے ظاہرِ طلسم میں چھپایا جاتا ہے۔ ان حالات میں آپ کے بلند مقاصد پر نظر رکھتے ہوئے میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے لئے یورپ جانا بے سود ہے۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب   اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

مصر جایئے، عربی زبان میں مہارت پیدا کیجئے، اسلامی علوم، اسلام کی دینی اور سیاسی تاریخ، تصوّف، فقہ، تفسیر کا بغور مطالعہ کر کے محمدؐ عربی کی اصلی روح تک پہنچنے کی کوشش کیجئے۔ پھر اگر ذہن خداداد ہے اور دل میں خدمت اسلام کی تڑپ ہے تو آپ اس تحریک کی بنیاد رکھ سکیں گے جو اس وقت آپ کے ذہن میں ہے۔[۲]

پروفیسر جی۔ ایس چٹرجی لکھتے ہیں:۔

"اقبالؔ کی قوّتِ فکر نے اُسے مشرق اور عالم اسلام کے اُن مصائب کے اسباب و علل سے آگاہ کیا اور اُس کی عاقبت بین

۱؎ مکاتیبِ اقبال صفحہ ۲۶۰

۲؎ ״ ״ ۳۹۸

لکڑوں نے اُن امراض کا مداوا اور اُس پستی و زبوں حالی سے نجات پانے کا اُن کو راستہ بتا دیا۔ چنانچہ اس دور میں اُن کے منہ سے بجائے ہندی ترانے کے اسلامی ترانہ ادا ہوا اور وطنیت کی محدود فضاؤں سے نکل کر وہ عالمگیر قومیت کی پیام رسانی کرنے لگے۔ اقبالؔ کے نزدیک اسلام ایک ایسا عالمگیر مذہب ہے جو انسان کی تقدیر اور اس کی ناقابل فتح روح کے تمام امکانات پر حاوی ہے۔؎

اقبالؔ نے اسی قسم کے تاثرات کا اظہار ذیل کے اشعار میں کیا ہے۔ ؎

وہی آب و گِلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی
نہ اُٹھا پھر کوئی رُومی عجم کے لالہ زاروں سے

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

غرضیکہ اب اُن کا عشق اُس طفلِ سادہ کا جیسا نہیں ہے جو چاند اور سورج کو دیکھ کر ان کی طرف ہاتھ پھیلا دیتا اور اُن کو اپنی آغوش میں لینے کی سعیٔ بے حاصل کرتا ہے۔ مگر یہ نہیں جانتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ بلکہ اُن کا عشق اُس بالغ انسان کا عشق ہے جو چاند اور سورج کا اس لئے دلدادہ ہے کہ اس کو نظامِ عالم میں بڑا دخل ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو دنیا خدا جانے کیا سے کیا ہو جائے!

بعض پچھلے شعراء نے عشقِ رسول ؐ کے ترانے اس انداز سے گائے ہیں کہ اُن سے اُن وارفتگی و شیفتگی کا اظہار تو ہوتا ہے مگر یہ بہت کم پتہ چلتا ہے کہ حضور سرورِ کائنات ؐ کی سیرت کا انہوں نے کیا اثر قبول کیا ہے۔ یہ انداز کچھ موجودہ دور کے شعراء کی داد کا سا ہے۔ کہ واہ وا کا شور تو زمین سے

؎ اقبالؔ نامہ صفحہ ۱۲۔

آسمان تک پہنچ گیا مگر یہ نہیں معلوم ہوا کہ شعر کی کونسی خوبیوں نے اُن کو اس تحسین و آفریں کے لئے مجبور کیا ہے۔ برخلاف اس کے کہ اقبال کا اظہار عشق اُس سخن شناس کا جیسا ہے جو شعر کی خوبیوں کو اچھی طرح سمجھ کر داد دااور سبحان اللہ کہتا ہے۔ اور شعر کے محاسن کی طرف لطیف اشارہ بھی کر جاتا ہے۔ یعنی محض عقیدہ نہیں بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حضورؐ کی ذاتِ اقدس دنیا پر ابرِ رحمت بن کر برسی ہے اور ایسی برسی ہے کہ ایک دنیا کی تمام کلفتیں دور ہو گئی ہیں۔ اور آج بھی اگر اخلاقی روشنی کہیں نظر آتی ہے تو وہ اُسی آفتاب عالمتاب کی ضیا باری کے آثار باقیہ ہیں۔ نیز اگر دنیا۔ حضورؐ ہی کے بتلائے ہوئے راستہ پر آجائے تو موجودہ تاریکیاں ... چھٹ کر آفتاب اسلام کی ضیا پاشیوں سے پھر منور ہو سکتی ہے۔ اس لئے وہ دنیا کو اس کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہیں کہ وہ اُٹھیں اوّل تو خود عمل کر کے دکھائیں پھر اس تعلیم سے دنیا کے گوشے گوشے کو روشناس کر دیں۔ یعنی ؎

مصلحت دید من آن ست کہ یاراں ہمہ کار
بگزرانند و خم طرۂ یارے گیرند

اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کی محبت، ہر صاحب عقل و بصیرت کو ہونی چاہیئے عقل و بصیرت ہوتے ہوئے بھی کسی کو محبت نہ ہو تو حیرت کی بات ہے! اسلام سے محبت کا باعث اس کے وہ نظریات ہیں جن کا اجمالی ذکر ابھی ابھی کیا جا چکا ہے۔ اور پیغمبرِ اسلامؐ سے محبت اس لئے کہ ان کے ذریعہ دنیا کو وہ کتاب ملی جو اس جامع و ہمہ گیر تعلیم کی حامل ہے۔ اور یہی نہیں کہ اُس نے کتاب دنیا کے سامنے لا کر رکھ دی یا اس کے معانی و مطالب بیان کر دیئے بلکہ اُس کے ایک ایک حرف کو اپنے اعمال و کردار کے

ذریعہ زندہ و فعّال صورت میں بھی دکھلا دیا۔ لہٰذا یہ کتاب اس کے اخلاق کا آئینہ اور اس کی ۔ ۔ ۔ سیرت کا مرقع بھی ہے۔ جہاں دوسرے مذاہب کی نہ کتابیں محفوظ اور نہ حاملانِ کتب کے حالاتِ زندگی محفوظ وہاں اسلام کی کتاب بھی محفوظ ہے اور اس کے پیغمبرِ اسلامؐ کے حالاتِ زندگی بھی محفوظ ہیں۔ پس قرآنِ پاک آئینِ حیاتِ انسانی بھی ہے اور مرقعِ اخلاقِ پیغمبرِ اسلام بھی۔ اور پیغمبرِ اسلام، صاحبِ کتاب بھی ہیں اور اپنی سیرت کے اعتبار سے کتاب بھی ؎

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ

یہی وجہ ہے کہ جہاں آپ کی سیرت دنیا نے قرآن کے حرفوں میں مرقوم دیکھی وہاں آپؐ کے اصحابؓ کی زندگیوں میں متحرک و انقلاب آفریں بھی دیکھ لی پھر وہ سیرت ایسی جامعیتِ کبریٰ کی مالک کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ نہیں جو اس میں آفتابِ عالمتاب کی روشنی سے محروم ہو۔ انفرادی زندگی ہو خواہ اجتماعی۔ خوانگی ہو خواہ شہری سب کے لئے برابر روشنی پہنچ رہی ہے۔ معاشیات، اخلاقیات، سیاسیات اور عمرانیات کے علماؑ جمع ہوں۔ اور حضورؐ کی زندگی کے ایک ایک باب اور ایک ایک فصل بلکہ ایک ایک حرف کو روایت و درایت اور جدید سے جدید اصولِ تحقیق و تنقید کی روشنی میں پرکھیں ہم پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ اس کی اکملیت و جامعیت اور پاکیزگی اور لطافت کو دل و جان سے خراجِ تحسین و عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہوں گے ؎

الٰہی اس طرف بھی وہ بتِ طنّاز آ نکلے
کہ آ جائے نصیحت واعظِ دیندار کے آگے

اقبالؔ نے بھی اپنی ہمہ گیر صلاحیتوں کی عینک سے کتاب و سنت کے

آئینوں میں جب اُس حُسنِ کائنات کے حُسن و جمال کا مشاہدہ کیا تو بزار دل و جان سے اس کے عاشق ہو گئے۔ کیسے عاشق ہوئے اس کا اندازہ ذیل کے چند بیانات سے کیجیے:-

مولانا سالک فرماتے ہیں "اُن کے گدازِ قلب اور رقتِ احساس کا یہ عالم تھا کہ جہاں ذرا حضور سرورِ کون و مکان صلی اللہ علیہ وسلم کی رافت و رحمت یا حضورؐ کی سرورئ کائنات کا ذکر آتا تو حضرت علامہ کی آنکھیں بے اختیار اشک بار ہو جاتیں اور دیر تک طبیعت نہ سنبھلتی۔"[1]

حکیم محمد حسن قرشی تحریر فرماتے ہیں "اس شیفتگی اور عشق کا اندازہ مشکل ہے جو اُن کو اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تھا۔ حضورؐ کا بیحد احترام کرتے تھے اور جدید تعلیم یافتہ مسلمان "محمدؐ صاحب" کہتا تو بہت تکلیف محسوس کرتے۔"[2] اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ "زندگی کے آخری دنوں میں کچھ لوگ اُن سے ملنے گئے۔ دیکھا کہ طبیعت بہت بےچین ہے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہیں۔ پوچھا خیر ہے؟ کہنے لگے آج ایک نوجوان مسلمان مجھ سے ملنے آیا تھا۔ مجھے سخت افسوس ہوا کہ جس قوم کے نوجوانوں کا یہ حال ہو اس کا انجام کیا ہوگا! کئی دن تک اس واقعہ کا اثر ان کے دل پر رہا۔"[3]

"زندگی کے آخری زمانے میں تو یہ حال ہو گیا

---

[1] اقبال نامہ صفحہ ۲۱، ۲۲

[2] اقبال نامہ صفحہ 52 [3] حیاتِ اقبال صفحہ ۱۱۵۔

تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آتا تو بے اختیار رو پڑتے تھے۔" لہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں "پنجاب کے ایک دولتمند رئیس نے ایک قانونی مشورے کے لئے اقبالؔ اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون داں اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں اُن کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت اقبالؔ اپنے کمرہ میں آرام کرنے کے لیے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ جس رسولِ پاکؐ کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں اُس نے بوریئے پر سو کر زندگی گزار دی تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ اُس بستر پر لیٹنا ان کے لئے ناممکن ہو گیا۔ اُٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بُلا کر اپنا بستر کھلوایا۔ اور ایک چارپائی اسی غسل خانہ میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے غسل خانے ہی میں سوتے رہے۔ یہ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے۔" ۲ے

زندگی کے آخری ایام کا ذکر ہے کہ مولانا اسلم جیراج پوری ملنے کے لیے گئے کر اور دیر تک سلسلہ گفتگو جاری رہا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اُس سال وہ حج کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر بیماری اور کمزوری کی حالت یہ تھی کہ کوٹھی سے باہر نکلنا بھی مشکل تھا۔ کہتے تھے کہ میں دو سال سے ارادۂ سفرِ حج میں ہوں بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لیے ہیں۔ جو سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا بھی

لہ جوہرِ اقبالؔ صفحہ نمبر ۳۹

۲ے ر ر ر ر ۳۶ و ۴۰۔

مکّہ سے مدینہ کی طرف روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے۔ جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

تو باش اینجا و باخاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے کوچۂ دوست

یہ شعر سُناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہوا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر موضوعِ سخن بدلنا پڑا۔" [1]

اس زمانے میں حج اور زیارتِ حرمین شریف کا شوق اس قدر زیادہ ہوا کہ اکثر یہی ذکر کیا کرتے۔

مولانا غلام رسول مہرؔ لکھتے ہیں۔

میں ۱۸ اپریل کی شام کو حاضر ہوا تو ایک صاحب حضرتِ مرحوم کے پاس بیٹھے تھے۔ میرے پہنچنے پر اُن صاحب نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ ابھی تو آپکو حجاز جانا ہے۔ حضرت فرمانے لگے کہ سہارنپور سے ایک صاحب نے لکھا ہے کہ میں نے حرمِ پاک کا طواف کرتے ہوئے بارگاہِ ایزدی میں دعا کی تھی کہ آپ کو بھی حرمِ پاک پہنچنا نصیب ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دعا قبول ہو گئی ہے۔ پھر فرمانے لگے اب بظاہر حجاز پہنچنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن دیکھئے خدا کو کیا منظور ہے"۔ [2]

میر غلام بھیک نیرنگ تحریر فرماتے ہیں۔

"۱۹۳۷ء کے موسم سرما میں ایک روز جاوید منزل میں ان سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک صحبت رہی، وہ اُس وقت

---

[1] آثارِ اقبال صفحہ نمبر ۹۔ [2] اقبال نامہ صفحہ نمبر ۷۰۔

بہت کمزور تھے۔ سفرِ مدینہ طیبہ کا ذکر بھی رہا۔ کہنے لگے جس قدر تھوڑی سی طاقت مجھ میں باقی رہ گئی ہے، میں اس کو مدینہ کے سفر کے لئے بچا بچا کر رکھ رہا ہوں۔ افسوس کہ اُن کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔ اور وہ دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

اقبالؔ کا قلبی تعلق حضور سرورِ کائناتؐ کی ذاتِ قدسی صفات سے اس قدر نازک تھا کہ حضورؐ کا ذکر آتے ہی اُن کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی، اگرچہ وہ فوراً ضبط کر لیتے تھے، چونکہ میں بارہا اُن کی یہ کیفیت دیکھ چکا تھا، اس لئے میں نے اُن کے سامنے تو نہیں کہا، مگر خاص لوگوں سے بطورِ راز ضرور کہا کہ یہ اگر حضور کے مرقدِ مبارک پر حاضر ہوں گے، تو زندہ واپس نہ آئیں گے، وہیں جاں بحق ہو جائیں گے۔ میرا اندازہ یہی تھا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔" [1]

خط لکھنے میں انسان تصنع سے کام نہیں لیتا کہ ایسا کرنے سے خط لکھنے کا مقصد فوت ہوتا ہے اس لئے خطوط انسان کا ایسا ذاتی بیان ہوتے ہیں جو تصنع اور تکلف سے خالی اور صداقت کا آئینہ دار ہو۔ لہٰذا ان کے خطوط سے چند اقتباسات کا درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:-

۱۳ر جون ۱۹۳۶ء کے ایک خط میں پروفیسر الیاس برنی کو لکھتے ہیں:-

آپ عاشقانِ رسولؐ میں سے ہیں اس واسطے ایک اور بات آپ کے گوش گزار کرنے کے لائق ہے۔ ۳ر اپریل کی رات ۳ بجے کے قریب (میں اس شب بھوپال میں تھا)،

---

[1] اقبالؔ بابت ۱۰ اکتوبر ۵۷ء صفحہ ۳۰۔

میں نے سرسید علیہ الرحمۃ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں کہ تم کب سے بیمار ہو۔ میں نے عرض کیا دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا حضورِ رسالت مآب کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ اسی وقت کھل گئی۔ اور اس عرضداشت کے چند شعر جو اب طویل نظم ہو گئی ہے، میری زبان پر جاری ہو گئے۔" [1]

ایک خط میں سید سلیمان ندوی کو سیرت النبی[2] کی تکمیل پہ لکھتے ہیں۔

آپ نے بڑا کام کیا ہے۔ اس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گزاری کی شکل میں مل رہا ہے اور دربارِ نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہو گا۔" [2]

میر غلام بھیک نیرنگ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضہ میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں، دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی انشاءاللہ تعالیٰ۔" [3]

ایک خط میں جو مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ کے نام ہے تحریر فرماتے ہیں۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ کا اخلاص اور محبت جو آپ کو حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے،

---

[1] مکاتیبِ اقبال صفحہ ۱۴ [2] مکاتیبِ اقبال ۱۱۲ [3] مکاتیبِ اقبال صفحہ ۲۰۷۔

آپ کے خاندان پر بہت بڑی برکات کے نزول کا باعث ہو گی۔[1]

ایک دوسرے خط میں جو دسمبر ۱۹۳۲ء کو لکھا گیا غلام میراں شاہ صاحب کو لکھتے ہیں۔

"الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں اور حج کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ خدا تعالیٰ آپ کو یہ سفر مبارک کرے اور اس کے فرشتوں کی رحمتیں آپ کے شریکِ حال ہوں۔ کاش کہ میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا۔ اور آپ کی صحبت کی برکت سے مستفیض ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ جدائی کے ایام ابھی کچھ باقی معلوم ہوتے ہیں۔ میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ حضورؐ کے روضۂ مبارک پر یاد بھی کیا جاؤں تاہم حضورؐ کے ارشاد سے جرأت ہوتی ہے کہ فرمایا ؎ الطالح لی۔ گنہگار میرے لئے ہے۔ اُمید ہے آپ اُس دربار میں پہنچکر مجھے فراموش نہ کریں گے۔"[2]

سید محفوظ علی بدایونی دسمبر ۱۹۳۳ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں "آپ کی بخیریت واپسی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کا حج قبول فرمائے اور آپ کو اپنے دین کی محبت اور اپنے حبیبؐ کے عشق سے مالامال فرمائے۔"[3]

ایک خط میں جو فروری ۱۹۳۶ء میں لکھا ہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی کو تحریر فرماتے ہیں۔

---

[1] مکاتبِ اقبال صفحہ ۲۲۲۔ [2] مکاتبِ اقبال صفحہ ۲۲۸

[3] مکاتبِ اقبال صفحہ ۲۳۲۔

"فقہی مسائل کے اختلافات اور علمائے اسلام کی جرح و قدح، جس میں حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق پوشیدہ ہے، ان تمام چیزوں کا مطالعہ بے حد روحانی لذت رکھتا ہے۔" ؎۱

ان ہی چند حوالوں پر اکتفا کرتے ہوئے اب ان کے تاثراتِ عشقِ رسول ان کے اشعار کے آئینے میں دیکھئے۔ اور حق یہ ہے کہ ان کے جذبات و واردات محبت کی اصلی صورت اگر کہیں نظر آتی ہے تو اسی آئینہ میں نظر آتی ہے اگرچہ عشق و محبت کے ایسے مقامات بھی آئے ہیں، جن کے بیان کرنے سے شعر بھی قاصر نظر آتا ہے۔

مثنوی اسرارِ خودی

اس عنوان کے تحت کہ "خودی از عشق و محبت استحکام می گیرد" لکھتے ہیں ؎

ہست معشوقے نہاں اندر دلت	چشم اگر داری بیا، بنمایمت
عاشقانِ او ز خوباں خوب تر	خوش تر و زیبا تر و محبوب تر
دل ز عشقِ او توانا می شود	خاک ہم دوشِ ثریا می شود
خاکِ نجد از فیضِ او چالاک شد	آمد اندر وجد و بر افلاک شد
در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ ست	آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است

یعنی مسلمان کے دل میں ہی ایک معشوق پوشیدہ ہے۔ اگر چشم بینا ہو تو اس کے جمال کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ اور وہ معشوق کیسا ہے؟ دنیا کے تمام حسینوں سے حسین تر اور محبوب تر

؎۱ مکاتیبِ اقبال صفحہ ۴۰۴۔

اس کے عشق سے دل (بجائے کمزور ہونے کے) توانا ہوتے ہیں اور خاک بھی بلند ہو کر ہم دوشِ ثریا ہو جاتی ہے۔ اس کے فیض سے خاکِ عرب پستیِ ذلت سے اُٹھ کر رفعتِ عزت و اقبال کی انتہا کو پہنچ گئی۔ وہ معشوق "مقامِ مصطفےٰ" ہے جو ہر مسلمان کے دل میں موجود ہے۔ ہر مسلمان حضورؐ کے نام پر مرتا ہے۔ اور دعویٰ کرتا ہے کہ میرا دل حضورؐ کی محبت سے خالی نہیں ہے مگر حضورؐ کا اتباع کر کے صفاتِ نبویؐ کو اپنے دل میں جذب کرلے تو پھر اس کے حسن و جمال اور قوت و رفعت کا کیا ٹھکانا ہے! سہ

ہر کہ عشقِ مصطفےٰؐ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

اس کے بعد حضورؐ سرورِ کائنات کی بعض خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں کہ آپ نے مسکینوں اور غریبوں کی سی زندگی بسر کی، حد ہے کہ بوریا آپؐ کا فرشِ خواب تھا۔ مگر اس لئے کہ ایسی بلند حوصلہ اُمت پیدا کی جس نے تاجِ کسریٰ کو اپنے پیروں تلے پامال کیا۔ غارِ حرا میں خلوت گزینی اور زہد و قناعت اختیار کی اس لئے کہ ایک زندہ قوم اور ایک نیا عالم پیدا کر دیا۔ راتوں آپؐ کی آنکھیں محرومِ خواب رہیں اس لئے کہ قوم کو تخت و تاج کا مالک بنا دیا۔ لڑائی کے وقت آپؐ کی تلوار آہن گداز تھی تو نماز میں آپؐ کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ نصرت کی دعا میں آپؐ کا آمین کہنا تلوار کا کام کرتا تھا تو میدانِ کارزار میں آپؐ کی تلوار نسلِ سلاطین کا قلع قمع کرتی تھی۔ آپؐ نے دنیا میں آئینِ نو ایجاد کیا اور اقوامِ عالم کی مسندوں کو الٹ کر رکھ دیا۔ دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھول دیا پر عمل پیرا کر کے ایک نہایت درجہ گری ہوئی قوم کو دنیا کی امامت اور بادشاہت کا مالک بنا دیا۔ اور ہمیشہ کے لئے اسی طرح دین کو دنیا کی کنجی قرار

دے دیا کہ دنیا کی سربلندی دین کی پابندی کے تابع ہے) آپؐ کی نگاہ میں پست و بلند ایک تھے۔ اپنے غلام کو اپنے دسترخوان پر اپنے ساتھ کھانا کھلاتے تھے۔ کیا اس جیسا بطنِ گیتی سے دوسرا پیدا ہوا ہے؟ ؎

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش — تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش

در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید

ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم — تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم

وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز — دیدۂ او اشکبار اندر نماز

در دعائے نصرت آمین تیغِ او — قاطعِ نسلِ سلاطین تیغِ او

در جہاں آئینِ نو ایجاد کرد — مسندِ اقوامِ عالم در نورد

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد — ہمچو او بطنِ امِ گیتی نزاد

در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

کیا آج خلوت گزینی، ترکِ دنیا، زہد و قناعت اور فقر و فاقہ، اختیار کرنے والوں کے پیشِ نظر بھی یہی مقاصد ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو اتباعِ رسولؐ کا دعویٰ کس لئے!

ایک جنگ میں اس شاہِ گردوں سریر کے روبرو حاتم طائی کی لڑکی قید ہو کر آئی پابہ زنجیر، بے پردہ اور شرم سے سر جھکائے ہوئے۔ حضورؐ نے لڑکی کو اس حال میں دیکھا تو اپنی چادرِ مبارک اس کے منہ پر ڈال دی۔

اقبالؒ کہتے ہیں کہ ؎

ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم — پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم

روزِ محشر اعتبارِ ماست او — در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

لطف و قہرِ او سراپا رحمتے — آں بیاراں، ایں باعدا رحمتے

آنکہ بر اعدا درِ رحمت کشاد — مکہ را پیغام لا تثریب داد

قوم اختلاطِ افراد سے بنتی ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ ہم حضورؐ کی محبت سے ایک زندہ و پائندہ قوم ہیں۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر گلِ صد برگ کی طرح جس کی پتیاں ہزار مگر بو ایک ہوتی ہے، ہم بھی حضورؐ کی محبت کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک ہو گئے ہیں۔ اور اسی چیز نے امتیازاتِ ملک و نسب سے بھی ہم کو پاک کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے رسالتِ محمدؐ کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے ایسی ملت پیدا کی جو ہر قسم کے امتیازات سے پاک اور دنیا بھر میں منتشر و پراگندہ ہونے کے باوجود ایک ہے ؎

ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم — چوں نگہ نورِ دو چشم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما — شبنمِ یک صبحِ خندانیم ما
مستِ چشمِ ساقیِ بطحاستیم — چوں نگہ نورِ دو چشم و یکیم
امتیازاتِ نسب را پاک سوخت — آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت
چوں گلِ صد برگ ما را بو یکیست — اوست جانِ ایں نظام و او یکیست

سِرِّ مکنونِ دلِ او ما بدیم
نعرہ بیباکانہ زد افشا شدیم

رموزِ بیخودی

وہی خیال جو اسرارِ خودی میں افراد کے متحد ہو کر ایک قوم بننے کے بیان میں ظاہر کیا تھا، یہاں ملت کی تعریف کے ضمن میں اس طرح اعادہ کیا ہے ؎

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید — وز رسالت در تنِ ما جاں دمید
حرف بے صوت اندریں عالم بدیم — از رسالت مصرعِ موزوں شدیم
از رسالت در جہاں تکوینِ ما — از رسالت دینِ ما آئینِ ما
از رسالت صد ہزار ما یک است — جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است

آنکہ شانِ اوست یَھْدِی مَنْ یُّرِید
از رسالت حلقہ گردِ ما کشید

حلقۂ ملت محیط افزا ستے
مرکزِ او وادیِ بطحا ستے

ما ز حکمِ نسبتِ او ملتیم
اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم

از میانِ بحرِ او خیزیم ما
مثلِ موج از ہم نمی ریزیم ما

امتنے در حرزِ دیوارِ حرم
نعرہ زن مانندِ شیراں در اجم

قلبِ مومن را کتابش قوت است
حکمتش حبل الورید ملت است

فرد از حق ملت از وے زندہ است
از شعاعِ مہرِ او تابندہ است

از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما

کثرتِ ہم مدعا وحدت شود
پختہ چوں وحدت شود ملت شود

زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است
وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است

دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم

ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اوست
ما کہ یکجانیم از احسانِ اوست

تا نہ ایں وحدت ز دستِ ما رود
ہستیِ ما با ابد ہمدم شود

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِؐ ما رسالت ختم کرد

رونق از ما محفلِ ایام را
او رسل را ختم، ما اقوام را

خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت
داد ما را آخریں جامے کہ داشت

"لا نبی بعدی" ز احسانِ خدا است
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیؐ است

قوم را سرمایۂ وحدت ازو
حفظِ سرِ وحدتِ ملت ازو

اس بات کو کہ ملتِ محمدیہؐ کسی خاص جگہ کے لئے نہیں ہے بلکہ سارے عالم کے لئے ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ پاک کے آئینے میں اس طرح دکھاتے

ہیں ۔

(۱) پیشِ پیغمبرؐ چو کعبؓ پاک زاد — ہدیۂ آورد از "بانت سعاد"

در ثنایش گوہرِ شب تاب سُفت — سیفِ مسلول از سیوفِ الہند گفت

آں مقامش برتر از چرخِ بلند — نامدش نسبت باقلیمے پسند

گفت سیفٌ من سیوفِ اللہ گو — حق پرستی جز براہِ حق مپو

حضرت کعبؓ نے حضورؐ کی مدح میں قصیدہ سُنایا تھا جو "بانت سعاد" کے نام سے مشہور ہے۔ قصیدے میں حضورؐ کو ایک جگہ "سیفٌ من سُیُوف الہند" کے الفاظ سے مخاطب کیا۔ حضورؐ نے اس تخصیص مقامی کو ناپسند فرماتے ہوئے اصلاح فرمائی کہ "سیفٌ من سُیُوف اللہ" کہنا چاہیے۔

(۲) ہمچناں آں رازدانِ جزو و کُل — گردِ پائش سُرمۂ چشمِ رُسُل

گفت با امت ز دنیائے شما — دوست دارم طاعت و طیب و نسا

گر ترا ذوقِ معانی رہنماست — نکتۂ پوشیدہ در حرفِ شماست

یعنی آں شمعِ شبستانِ وجود — بود در دنیا و از دنیا نبود

جلوۂ او قدسیاں را سینہ سوز — بود اندر آب و گل آدم ہنوز

من ندانم مرز و بوم او کجاست — ایں قدر دانم کہ با ما آشناست

ایں عناصر را جہانِ ما شمرد — خویشتن را میہمانِ ما شمرد

زانکہ ما از سینہ جاں گم کردہ ایم — خویش را در خاکداں گم کردہ ایم

مسلم استی دل باقلیمے مبند — گم مشو اندر جہانِ چون و چند

می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم — در دلِ او یاوہ گردد شام و رُوم

دل بدست آور کہ در پہنائے دل — می شود گم ایں سرائے آب و گل

حضورؐ نے فرمایا ہے، حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمْ اَلنِّسَاءُ وَالطِّیبُ وَجُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ ط

میں تمہاری دنیا میں سے عورت اور خوشبو کو دوست رکھتا ہوں۔ اور نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر تم ذوقِ معانی رکھتے ہو تو حرفِ "شما" میں نکتہ چھپا ہوا ہے وہ یہ کہ وہ شمعِ شبستانِ وجود دنیا میں ہوتے ہوئے دنیا سے الگ تھا۔

آدم ابھی آب و گل میں تھے کہ وہ محبوبِ قدسیاں بنا ہوا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ اس کا وطن کہاں ہے۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہم سے بخوبی واقف ہے۔ جب ہی تو اس نے عناصر کو ہمارا جہان اور اپنے آپ کو ہمارا مہمان کہا ہے۔ اس لئے ہمارا سینہ دل سے خالی ہے اور ہم اس خاکدان میں گم ہو چکے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں۔ تم مسلمان ہو ملک و وطن سے دل نہ لگاؤ۔ یعنی اس جہانِ چون و چند میں گم نہ ہو جاؤ۔ مسلمان ملک و وطن میں گم نہیں ہوتا۔ بلکہ شام و روم (ملک و وطن) اس کے دل میں گم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا تم ایسا وسیع دل پیدا کرو جس میں یہ سرائے آب و گل گم ہو جائے۔

(۲) عقدۂ قومیت مسلم کشود / از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملت گیتی نورد / بر اساس کلمۂ تعمیر کرد
تا ز بخششہائے آں سلطانِ دینؐ / مسجد ما شد ہمہ روئے زمین
آنکہ در قرآن خدا او را ستود / آنکہ حفظِ جانِ او موعود بود
دشمنان بے دست و پا از ہیبتش / لرزہ بر تن از شکوہ فطرتش
پس چرا از مسکن آبا گریخت؟ / تو گمان داری کہ از اعدا گریخت؟
قصہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند / معنیٔ ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است / ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
معنی او از تنک آبی رم است / ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است
بگذر از گل گلستان مقصود تست / ایں زیاں پیرایۂ بہبود تست

آقائے دوعالم نے وطن سے ہجرت فرما کر قومیتِ مسلم کا مطلب واضح کیا ہے۔ آپ کی حکمت نے (وطن کی بجائے)، کلمۂ توحید کی بنیاد پر ایک عالمگیر ملّت تعمیر کی ہے۔ اور اس طرح اُس سلطانِ دین کی بخشش سے تمام زمین ہمارے لئے مسجد ہو گئی ہے۔

وہ کہ خدا نے جس کی تعریف قرآنِ کریم میں کی ہے، جس کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ جس کی ہیبت سے دشمن بے بس و مجبور، جس کے شکوہِ فطرت سے اعدائے دین لرزہ بر اندام" اپنے آبائی وطن سے کیوں بھاگا؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ دشمنوں سے ڈر کر بھاگا؟ قصہ گوؤں نے حق کو چھپایا ہے یا ہجرت کے معنی غلط سمجھے ہیں۔ ہجرت تو مسلمان کی زندگی کا آئین ہے۔ اور اُس کے ثبات و بقا کا باعث۔ اس کے معنی کم فہمی و کم حوصلگی کی وجہ سے بھاگنے کے لئے ہیں۔ ورنہ شبنم کو سمندر کی خاطر ترک کیا گیا ہے۔ اس لئے اے مسلمان! پھول (محدود وطنیت) کو چھوڑ دے کہ تیرا مقصود گلستان (عالمگیر اخوت) ہے اور اس بظاہر نقصان میں ہی تیرے فائدے کا راز پوشیدہ ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں "اسی سلسلے میں ڈاکٹر اقبال نے اس مشہور اعتراض کا جواب دیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت پر کیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت دشمنوں سے ایک فرار کی صورت تھی اور اس قسم کی بزدلی ایک اولوالعزم پیغمبر کے شایانِ شان نہیں — علامہ ابنِ قیم نے لکھا ہے کہ یہ بزدلی نہیں بلکہ جرأت و ہمت تھی۔ اور ہجرت جہاد کا مقدمہ و اعلان تھی۔ لیکن ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد ایک ایسی عالمگیر ملّت کا پیدا کرنا تھا جو وطنیت کی قید سے آزاد ہو۔ اس لئے آپ نے مکّہ سے نکل کر مدینہ میں اس قسم کی قوم پیدا کی اور وطنیت کا خاتمہ کر دیا۔"

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست

بادۂ تندش بجامے بستہ نیست [1]

اس بارے میں کہ "ملّتِ محمدیہ نہایتِ زمانی نہیں رکھتی" بہت سے دلائل پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ؎

زانکہ مارا فطرت ابراہیمی است

ہم بہ مولیٰ نسبت ابراہیمی است

فرماتے ہیں کہ سیرتِ ملیہ کی پختگی آئینِ الٰہی کے اتباع پر موقوف ہے اس لئے اگر ؎

شارعِ آئین شناسِ خوب وزشت | بہرِ تو ایں نسخۂ قدرت نوشت
ازعمل آہن، عصب می سازدت | جاے خوب و بہتر جہاں اندازدت
خستہ باشی استوارت می کند | پختہ مثلِ کوہسارت می کند
ہست دینِ مصطفیٰؐ دینِ حیات | شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
گر زمینی آسماں سازد ترا | آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

صیقلش آئینہ سازد سنگ را

از دلِ آہن رباید زنگ را

تا شعارِ مصطفیٰؐ از دست رفت | قوم را رازِ حیات از دست رفت
آں نہالِ سربلند و استوار | مسلمِ صحرائیؐ اشتر سوار
پائے تا در وادیٔ بطحا گرفت | تربیت از گرمیٔ صحرا گرفت
آں چناں کاہید از بادِ عجم | ہمچو نے گردید از بادِ عجم

---

[1] مقالاتِ یومِ اقبال صفحہ ۱۳۔

آئینِ الٰہی کی تعریف کرتے ہیں کہ شارع علیہ السلام نے، جو خوب و زشت کو جانتا ہے، مسلمان کے لئے یہ نسخۂ قوت و اقتدار لکھا ہے۔ اس پر عمل کرنے سے آدمی آہن عصب (نہایت قوی) اور دنیا میں بہترین مقام پر فائز ہوتا ہے۔ یہ خستہ کو پہاڑ کی طرح پختہ و استوار کرتا ہے۔ دینِ مصطفےٰ پر عمل پیرا ہونے سے زندگی اور ضابطہ کی پابندی حاصل ہوتی ہے اگر وہ میں (پست) ہے تو یہ اسکو آسمان (بلند) بناتا ہے۔ بلکہ ایسا بناتا ہے جیسا خدا چاہتا ہے کہ وہ بنے۔ یہ صیقل ہے کہ زنگ کو صاف کر کے انسان کو آئینے کی مثال بنا دیتا ہے۔

قوم نے جب سے شعارِ مصطفےٰ کو چھوڑا ہے، زندگی سے محروم ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ نہالِ سربلند و استوار یعنی شترِ سوادِ صحرائی مسلمان جب تک وادیٔ بطحیٰ میں رہا، گرمیٔ صحرا سے تربیت حاصل کرتا رہا۔ مگر جب سے عجم میں آیا اور عجمی تصورات سے متاثر ہوا ہے۔ اس کی قوت میں زوال ہی آتا چلا گیا۔ اور اب اس کی ناتوانی کی کوئی حد نہیں ہے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں ؎

شیخ احمد سیدِ گردوں جناب — کاسب نور از ضمیرش آفتاب
گل کرمی خیزد مزارِ پاکِ او — لالہ گویاں دمد از خاکِ او
با مریدے گفت اے جانِ پدر! — از خیالاتِ عجم باید حذر
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گزشت — از حدِ دینِ نبیؐ بیروں گزشت

اس سلسلے میں کہ "حسنِ سیرتِ ملی" آدابِ محمدیؐ کے ساتھ ادا ہے آپ کو مؤدب بنانے میں ہے" اپنے والدِ مرحوم کی زبان سے فرماتے ہیں۔ والد نے جوانی میں ایک موقعہ پر نصیحت کی تھی کہ ؎

آنکہ مہتاب از سرِ انگشتش دو نیم — رحمتِ او عام و اخلاقش عظیم

از مقامِ او اگر دور ایستی | از میانِ معشرِ ما نیستی
طینتِ پاکِ مسلماں گوہر است | آب و تابش از یمِ پیغمبرؐ است
آبِ نیسانی بآغوشش درآ | وز میانِ قلزمش گوہر برآ
در جہاں روشن تر از خورشید شو | طالبِ تابانیٔ جاوید شو

اس سلسلے میں کہ "حقیقی جمعیت نصب العین کے مضبوط تھامے رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اُمتِ محمدیہ کا نصب العین حفظ و نشر توحید ہے اور بس" فرماتے ہیں ؎

اُمتے پاک از ہوی گفتار او | شرحِ رمزِ ما غوی گفتار او
تا بدست آورد نبضِ کائنات | وا نمود اسرارِ تقویمِ حیات
از قبیلے لالہ ہائے این چمن | پاک شست آلودگی ہائے کہن
در جہاں وابستۂ دینش حیات | نیست ممکن جز بآئینش حیات
اے کہ می داری کتابش در بغل | تیز تر نہ پا بہ میدانِ عمل

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ فکرِ انسانی اجو بت گرد بت پرست واقع ہوئی ہے اور ہر وقت ایک نئے بت کی تلاش میں رہتی ہے، اس نے پھر آذری شروع کی ہے اور ایک نیا بت بنایا ہے، ایسا بت کہ جس کو خون ریزی میں مزا آتا ہے۔ اس بت کا نام رنگ، نسب اور ملک ہے، اس نابکار بت کے قدموں پر آدمیت کو بھیڑ بکری کی طرح قربان کر دیا گیا ہے۔
اے مسلمان! تو نے مینائے خلیلؑ سے شراب پی ہے اس لئے تیرے خون میں صہبائے خلیلؑ کی گرمی ہے اس حق کے بھیس میں چھپے ہوئے باطل کو بھی لاموجود الا اللہ کی تلوار سے ہلاک کر دے تا کہ یہ تاریکی دور ہو۔ اور دنیا پھر توحید اور احترامِ آدمیت کے نور سے منور ہو جائے ۔۔۔
غرضکہ جو چیز تجھ پر کامل ہوئی ہے اس کو عام یعنی دنیا کو نعمتِ اسلام سے

بہرہ ور کر دے۔ ورنہ ؎

لرزم از شرمِ تو چوں روزِ شمار | پرسدت آں آبروئے روزگار
حرفِ حق از حضرتِ ما بردۂ | پس چرا با دیگراں نسپردۂ

اس بیان میں کہ "توسیع حیاتِ ملّی نظامِ عالم کی قوتوں کو مسخر کرنے پر موقوف ہے" فرماتے ہیں ؎

آنکہ برش قدسیاں را سجدہ ہشت | اوّل آدم را سرِ فتراک بست
عقدۂ محسوس را اوّل کشود | ہمت از تسخیرِ موجود آزمود

بقائے نوع، اُمومت (عورت) کی وجہ سے ہے اور حفظ و احترامِ اُمومت اصلِ اسلام ہے، چنانچہ اقبالؔ حضورؐ نبی کریمؐ کے عمل سے استدلال کرتے ہیں کہ ؎

آنکہ نازد بر وجودش کائنات | ذکرِ او فرمود با طیب و صلوٰۃ
مسلمے کو را پرستارے شمرد | بہرۂ از حکمتِ قرآں نبرد
نیک اگر بینی اُمومت رحمت است | زانکہ او را با نبوت نسبت است
شفقتِ او شفقتِ پیغمبرؐ است | سیرتِ اقوام را صورت گر است
ہست اگر فرہنگِ تو معنی رسے | حرفِ اُمّت نکتہ ہا دارد بسے
گفت آں مقصودِ حرفِ کُن فکاں | زیرِ پائے اُمّہات آمد جناں
ملّت از تکریمِ ارحام است و بس | ورنہ کارِ زندگی خام است و بس

پہلے شعر میں جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس سے پہلے لکھی جا چکی ہے۔ چھٹے شعر میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ

اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ اَقْدَامِ اُمَّہَاتِکُمْ (یا تحت اقدامِ اُمّہات)

جنت تمہاری ماؤں کے قدموں میں ہے۔

آخری شعر میں قرآنِ کریم کے اس ارشاد کی ترجمانی ہے۔ کہ فرمایا

وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ؁

جو لوگ صلۂ رحمی کو قطع کرتے ہیں یعنی اللہ نے جس رشتے کو جوڑنے کا حکم دیا ہے اُسے توڑتے ہیں اور زمین پر فساد برپا کرتے ہیں وہ خسارہ میں رہنے والے ہیں۔ ان وجوہ سے اقبالؔ کا یہ کہنا درست ہے کہ جو مسلمان عورت کو ذلیل سمجھتا ہے وہ قرآن مجید کی تعلیمات سے بہرہ ور نہیں ہے۔ ؎

مُلّے کورا پرستارے شمرد
بہرۂ از حکمتِ قرآں نبرد

حضورؐ نے جو عورت کی تعریف کی ہے اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ عورت کو بجائے کنیز و خادمہ سمجھنے کے اس کا احترام کیا جائے کہ نظامِ ملت اور حسن و معاشرت کے لئے اس کی ضرورت ہے، اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ عورت بھی ... فرمودۂ سرورِ کونینؐ پر ناز کرتے ہوئے اپنے مقام کو پہچانے اور معاشرہ کے حق میں فساد کا باعث بن کر اپنے آپ کو ذلیل و خوار نہ کرے۔ اقبالؔ فرماتے ہیں گاؤں کی وہ جاہل، پست قامت، موٹی بد صورت، غیر مہذب، نا تربیت یافتہ کم عقل، کم گو اور سادہ لڑکی جس کا آلامِ نسوانی سے دل خون ہو گیا ہے اور جس کی آنکھوں کے گرد نیلے حلقے پڑ گئے ہیں۔ اگر ملت کو اس کی آغوش سے ایک مسلمان غیور و حق پرست فرزند ملتا ہے تو ہماری ہستی اس کے آلام سے محکم اور ہماری صبح اس کی شام سے عالم افروز ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف وہ تہی آغوش، نازک پیکر، جس کی نگاہ جادو کی قیامت بھی خانہ پرور، جس کی فکر مغرب کی روشنی سے منوّر، جس کا ظاہر زن، اور باطن نازن ہے، جس نے ملتِ بیضا کی آئینی پابندیوں کو توڑ کر رکھ دیا ہے جس کی آنکھوں سے عشوہ و ناز حل ہو کر بہہ رہا ہے، جس کی آزادی گستاخ، فتنہ زا اور حیا سے ناآشنا ہے، جس کا علم بارِ امومت کا متحمل نہ ہو سکا اس سبب سے اس کی شام میں

ایک ستارہ کبھی نہ چمکا (آغوش اولاد سے خالی رہی)، ایسا پھول خدا کرے ہمارے باغ میں نہ اُگے اور اُس کا داغ ملّت کی پیشانی سے دُور رہے۔ یعنی ایسی لڑکی ملّتِ اسلامیہ کو نہیں چاہیئے۔ کہ اس کا وجود اسلام کی پیشانی کے لئے بدنما داغ ہے۔

"عرضِ حال بحضور رحمۃ اللعالمین" بھی سن لیجئے:-

اے ظہورِ تو شتاب زندگی — جلوہ ات تعبیر خوابِ زندگی
از تو بالا پایۂ ایں کائنات — فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات
در جہاں شمع حیات افروختی — بندگاں را خواجگی آموختی
بے تو از نابود مندیہا خجل — پیکرانِ ایں سرائے آب و گل
تا دمِ تو آتشے از گل کشود — تودہ ہائے خاک را آدم نمود
ذرّہ دامن گیر مہر و ماہ شد — یعنی از نیروے خود آگاہ شد

بلکہ عرضِ حال میں تو اپنی محبت کی ابتدا اور انتہا بھی بیان کر دی ہے اور اپنا مقصدِ حیات بھی ظاہر کر دیا ہے۔

تا مرا افتادہ بر رویت نظر — از آب و اُم گشتۂ محبوب تر
عشق در من آتشے افروخت است — فرصتش بادا کہ جانم سوخت است

اے بصیری را ردا بخشندۂ — بربطِ سلما مرا بخشندۂ
ذوقِ حق دہ ایں خطا اندیش را — ایں کہ نشناسد متاعِ خویش را
گر دلم آئینۂ بے جوہر است — در بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
اے فروغت صبحِ اعصار و دہور — چشمِ تو بینندۂ ما فی الصدور
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن — ایں خیاباں را زخارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

در دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام | با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
ایکہ از احسانِ تو ناکس کس است | یک دعایت مزدِ گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدائے عز و جل | عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ | بہرۂ از علمِ دیں بخشیدۂ

در عمل پایندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

رخصتِ جاں تا در جہاں آوردہ ام | آرزوئے دیگرے پروردہ ام
ہمچو دل در سینہ ام آسودہ است | محرم از صبحِ حیاتم بودہ است
از پدر تا نام تو آموختم | آتشِ ایں آرزو افروختم
تا فلک دیرینہ تر سازد مرا | در قمارِ زندگی بازد مرا
آرزوئے من جواں تر می شود | ایں کہن صہبا گراں تر می شود
ایں تمنا زیرِ خاکم گوہر است | در شبم تابِ ہمیں یک اختر است

اس کے بعد اپنی سرگذشتِ زندگی بیان کرتے ہیں کہ ایک دور وہ آیا کہ میں ایک مدت لالہ رو حسینوں کے عشق میں گرفتار رہا۔ چراغِ عافیت کو گل کرکے ماہ سیماؤں کے ساتھ شغلِ مے اختیار کیا۔ میرے حاصل کے گرد بجلیاں رقص کرتی تھیں اور میری متاعِ دل کو رہزن چراتے تھے۔ مگر یہ شرابِ (آرزو) میرے پیمانے سے نہیں چھلکی اور یہ زرِ ناب میرے دامن سے نہیں گزرا ــــ دوسرا دور وہ آیا جب عقلِ آذر پیشہ نے میرے گلے میں زنار ڈالا اور اس کا نقش میرے کشورِ جاں میں بیٹھ گیا۔ سالہا سال خشک میرے دماغِ خشک کا جزوِ لاینفک رہا۔ علم الیقیں کا ایک حرف نہیں پڑھا۔ گمان آبادِ حکمت میں رہتا تھا۔ میری ظلمت تابِ حق سے اور میری شام نورِ شفق سے بیگانہ

تھی مگر یہ تمنّا میرے دل میں اُسی طرح پوشیدہ رہی جس طرح موتی صدف میں رہتا ہے۔ آخر میرے پیمانۂ چشم سے ٹپک گئی اور اس نے میرے ضمیر میں نغمے پیدا کر دیئے۔ اس کے بعد اظہار تمنّا کرتے ہیں۔ مگر اظہار کا انداز دیکھئے:- ؎

اے زیادِ غیرِ تو جانم تہی ۔۔۔ بر لبش آرم اگر فرماں دہی
زندگی را از عمل ساماں نبود ۔۔۔ پس مرا ایں آرزو شایاں نبود
شرم از اظہار می آید مرا ۔۔۔ شفقت تو جرأت افزاید مرا
ہست شانِ رحمتِ گیتی نواز ۔۔۔ آرزو دارم کہ میرم در حجاز

پھر عرض کرتے ہیں کہ وہ مسلمان جو ماسوی اللہ سے بیگانہ ہے۔ بتخانہ کا زنّاری کب تک رہے! بڑے افسوس کی بات ہے کہ جب اُس کا وقت آئے تو اس کے جسدِ خاکی کو دیر (ہندوستان) اپنی آغوش میں لے اگر میرے اجزائے تن قیامت کے دن آپ کے در سے (زندہ ہو کر) اُٹھیں

تو جہانِ امروز قابلِ صد افسوس ہے وہاں فردا اتنا ہی زیادہ اچھا ہو جائے گا جس شہر میں آپ رہ رہے ہیں۔ کتنا اچھا شہر ہے! جس خاک میں آپ آرام فرما ہیں کیسی اچھی خاک ہے! ؎

مسکنِ یار است و شہرِ شاہِ من ۔۔۔ پیشِ عاشق ایں بود حُبُّ الوطن
کو کبم را دیدۂ بیدار بخش ۔۔۔ مرقدے در سایۂ دیوار بخش
تا بیاساید دلِ بیتابِ من ۔۔۔ بستگی پیدا کند سیمابِ من

با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغازم، انجامم نگر

پیامِ مشرق

علم کی اہمیت واضح کرتے کے لیے امان اللہ خاں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؎

سیدِ کل، صاحبِ امّ الکتاب پردگیہا بر ضمیرش بے حجاب
گرچہ عینِ ذات را بے پردہ دید ربِ زدنی از زبانِ او چکید

"خطاب بہ مصطفےٰ کمال پاشا" والی نظم میں لکھتے ہیں ؎

اُمتے بود کہ ما از اثرِ حکمتِ او واقف از سرّ نہانخانۂ تقدیر شدیم
اصلِ ما یک شررِ باختہ رنگے بودہ است نظرے کرد کہ خورشید جہانتاب شدیم

بانگِ درا

پیامِ مشرق کے ایک سال بعد ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی مگر اس میں اقبال کا ۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۴ء تک کا کلام ہے۔ ہم ابتدائی دور کو چھوڑ کر ۱۹۰۸ء کے بعد کے کلام کو دیکھتے ہیں جب کہ وہ یورپ سے تعلیم پا کر واپس آگئے تھے۔ تاکہ فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو کلام سے بھی اُن کے عشقِ رسولؐ کا حال معلوم ہو۔ اس جائزے میں سب سے پہلے ہمارے سامنے اُن کی نظم "بلادِ اسلامیہ" آتی ہے جس میں وہ دلّی سے شروع ہو کر بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ کو اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کے بعد مدینۃ النبیؐ سے اس طرح خطاب کرتے ہیں ؎

وہ زمیں ہے تو مگر اے خوابگاہِ مصطفےٰؐ دید ہے کعبہ کو تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں

گھر میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی ‏— جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
نام لیوا جس کے شاہنشاہِ عالم کے ہوئے ‏— جانشیں قیصر کے، وارث مسندِ جم کے ہوئے
ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام ‏— ہند ہی بنیاد ہے اُس کی، نہ فارس ہے نہ شام
آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو، ماویٰ ہے تو ‏— نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

"ایک حاجی مدینہ کے راستہ میں" والی نظم میں حاجی کی زبان سے فرماتے ہیں ؎

خوف کہتا ہے کہ یثرب کی طرف تنہا نہ چل ‏— شوق کہتا ہے کہ تو مسلم ہے بیباکانہ چل
بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا! ‏— عاشقوں کو روزِ محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا!
خوفِ جاں رکھتا نہیں کچھ دشت پیمائے حجاز ‏— ہجرتِ مدفونِ یثرب میں یہی مخفی ہے راز
گو سلامت محملِ شامی کی ہمراہی میں ہے ‏— عشق کی لذت مگر خطروں کی جانکاہی میں ہے

اس کے بعد نظم "حضورِ رسالت مآب" میں پڑھیے۔ شاعر تصور کے پروں سے اڑ کر فرشتوں کے ہمراہ حضورِ رسالت مآب میں پہنچ جاتا ہے۔ حضورؐ دریافت فرماتے ہیں ؎

نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا ‏— ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

شاعر عرض کرتا ہے ؎

حضورؐ دہر میں آسودگی نہیں ملتی ‏— تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی!
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں ‏— وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں ‏— جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں ‏— طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

جوابِ شکوہ میں لکھتے ہیں ؎

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں، دامن کہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراقش کے بیاباں میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایماں میں ہے

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے!
رفعتِ شانِ رَفَعنَا لَکَ ذِکرَکَ دیکھے

مردم چشم زمیں، یعنی وہ کالی دنیا
وہ تمھارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمیٔ مہر کی پروردہ، ہلالی دنیا
عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

ابو طالب کلیم کے شعر کو تضمین کرتے ہیں ؎

خوب ہے تجھ کو شعار صاحبِ یثرب کا پاس!
کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں!
جس سے تیرے حلقۂ خاتم میں تھا گردوں اسیر
اے سلیماں! تیری غفلت نے گنوایا وہ نگیں

یعنی حضورؐ کا اتباع دنیا میں سربلندی اور کامرانی کا باعث تھا۔ جب سے اتباع کی بجائے نافرمانی شروع کی ہے آسمانِ رفعت سے خاکِ مذلت پر آپڑے ہیں۔ اگر عزت و اقبال کی تمنا ہے تو پھر حضورؐ کے اتباع کو اپنا شعار بنانا ہوگا ؎

غافل اپنے آشیاں کو آکے پھر آباد کر
نغمہ زن ہے طورِ معنی پر کلیم نکتہ بیں
سرکشی باہر کہ کردی رام او باید شدن
شعلہ ساں از ہر کجا برخاستی آنجا نشیں

"صدیق" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔ یہ نظم صحابۂ رسولؐ کی پروانہ وار محبت کا بیان بھی ہے کہ یہ حضرات حضورؐ کے مقابلے میں کسی چیز کو بھی عزیز نہیں رکھتے

ہے نیز اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی تعلیم نے لوگوں کے قلوب و اذہان کو کیا متاثر کیا تھا اور اُن میں کیسی ہم آہنگی و یک رنگی پیدا کر دی تھی کہ ہر فرد کا ایک ہی مقصدِ حیات بن گیا تھا۔ جس کے حصول کے لئے وہ قربانی، ایثار اور تسلیم و رضا کے لئے دوسرے سے آگے نکل جانے میں یکساں کوشش کرتا تھا اس کے ساتھ ہی نظم کا ایک ایک لفظ خود اقبالؔ کی محبت رسولؐ کا آئینہ دار بھی ہے۔ ؎

اِک دن رسولِ پاکؐ نے اصحابؓ سے کہا — دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار
ارشاد سُن کے فرطِ طرب میں عمرؓ اُٹھے — اُس روز اُن پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور — بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار
لائے غرض کہ مالِ رسولِؐ امیں کے پاس — ایثار کی ہے دست نگر ابتدائے کار
پوچھا حضورِ سرورِ عالمؐ نے اے عمرؓ! — اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار!
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟ — مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار

کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار

اتنے میں وہ رفیقِ نبوّت بھی آگیا — جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت — ہر چیز جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار
ملکِ یمین و درہم و دینار و رخت و جنس — اسپِ قمر سُم و شتر و قاطر و حمار
بولے حضورؐ چاہئے فکرِ عیال بھی! — کہنے لگا وہ عشق و محبت کا راز دار
اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر — اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس

حضرتِ بلالؓ جو نسلاً حبشی تھے۔ اور اسلام لانے سے پہلے غلام بھی تھے۔ عاشقانِ رسولؐ کی صفِ اوّل میں ہیں اور حضورؐ کے عشق کا صدقہ

ہے کہ آج بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یوں تو ہر عاشق رسولؐ زندہ جاوید ہے۔ مگر یہ کس چیز کے ساتھ زندہ ہیں؟ اذان کے ساتھ، جس کے بادشاہ وفقیر سب محکوم ہیں۔ جو رنگ ونسل اور ملک ووطن کے امتیازات کو مٹا کر غریب وامیر کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ جس سے مسلمان کے دل میں ایمان کی حرارت پیدا ہوتی ہے اور جس کو فلک پر صدیوں سے اسی طرح سن رہا ہے۔

اس کے برعکس سکندر رومی، جس نے ایک دنیا کو فتح کیا۔ اور جس کی کثرت افواج اور دبدبہ وشکوہ سے دنیا لرزہ براندام تھی۔ آج تاریخ میں مشتبہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو ایک نظم میں جس کا نام ... "بلالؓ" ہے اس طرح بیان کیا ہے ؂

لکھا ہے ایک مغربی حق شناس نے
اہلِ قلم میں جس کا بہت احترام تھا

جولاں گہ سکندرِ رومی تھا ایشیا
گردوں سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا

تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے
دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا

دنیا کے اس شہنشہِ انجم سپاہ کو
حیرت سے دیکھتا فلکِ نیلی فام تھا

آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں
تاریخ دان بھی اسے پہچانتا نہیں

لیکن بلالؓ وہ حبشی زادۂ حقیر
فطرت تھی جس کی نورِ نبوت سے مستنیر

جس کا امیں ازل سے ہوا سینۂ بلالؓ
محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشہ و فقیر

ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط
کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر

ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز
صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوشِ چرخِ پیر

اقبالؔ کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

ایک غزل کا شعر ہے ؂

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم!
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

یعنی حضور اکرمؐ نے خود شناس انسان کو کیسا خود شناس بنا دیا کہ یا مٹی پتھر بلکہ نجاست تک کی پرستش کرتا تھا یا اسلام کا کلمہ پڑھتے ہی اس کا دماغ ایسا افلاک پر پہنچا کہ اب اس کا سر خدا کے سوا اور کسی کے آگے نہیں جھکتا۔ اس لئے پھر حضورؐ ہی سے درخواستِ کرم کرتا ہے کہ یہ دماغِ سکندری حضورؐ ہی کا عطا کیا ہوا ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد ترکوں کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ اور ان کو معلوم ہوتا ہے کہ دوست کون ہے اور دشمن کون۔ نیز ۱۹۲۳ء میں مصطفیٰ کمال نے ترکوں کو آزاد کرایا اور برطانوی فوجیں قسطنطنیہ سے پسپا ہوئیں۔ تو دنیائے اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور کسی قدر بیداری کے آثار بھی پیدا ہو گئے تو اقبالؔ بے حد خوش ہیں اور اس خوشی کے نشے میں سرشار ہو کر نظم "طلوعِ اسلام" لکھتے ہیں۔ اور فرطِ مسرت میں آخری بند فارسی میں لکھ جاتے ہیں۔ کہ یہ زبان اسلامی ممالک میں کم و بیش ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ نیز دلولۂ شوق و جوشِ دل کی ترجمانی دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ کرتی ہے۔ مگر اس انتہائی خوشی کی حالت میں بھی معاً خیال آ جاتا ہے کہ یہ سب کچھ کس کی جوتیوں کا صدقہ ہے؟ اسی کا جس نے بدر و حنین کی جنگوں میں شریک ہو کر خود جہاد کیا اور اس طرح قوم کو سربکف ہو کر اسلام کے لئے جہاد کرنے کی تعلیم دی۔ اس لئے فرماتے ہیں ؎

بہ مستاں قالِ حدیثِ خواجۂ بدر و حنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشم آشکار آمد

ایک غزل کا شعر ہے ؎

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو یہ پیغام مِرا
قبضہ سے بچاری امّت کے اب دین بھی گیا دنیا بھی گئی

یعنی جس کملی والے نے مسلمانوں کو دنیا و دین کی سربلندیوں سے مالامال کیا تھا۔ آج جب کہ قوم اس کا راستہ چھوڑ کر کہیں کی نہ رہی تو ایسے وقت میں بھی اسی کی یاد آ رہی ہے۔ اس لئے کہ مصیبت میں انسان اسی کو یاد کرتا ہے۔ جو سب سے زیادہ شفیق اور مہربان ہو۔

زبورِ عجم (گلشنِ رازِ جدید)

جہاں جبر و قدر کی بحث آئی، فرماتے ہیں ؎

چنیں فرمودۂ سلطانِ بدر است
کہ ایمان درمیانِ جبر و قدر است

فلسفہ کی بحث ہے خود بھی فلسفی ہیں۔ مگر جبر و قدر کے نظریات کی ضرر رسانی کو خوب جانتے ہیں اس لئے جب ان نظریات کی فتنہ سامانی ذہن کے سامنے آتی ہے تو معاً اسی دانائے کل کا ارشادِ گرامی یاد آ جاتا ہے جس نے زندگی کے کسی راستے میں ہدایت و رہنمائی سے محروم نہیں رکھا ہے۔ اور یہی نہیں کہ ارشاد والا یاد آ جاتا ہے بلکہ بدر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے جہاں اس ارشاد کو عملی صورت میں دکھلایا گیا تھا۔ کہ ۳۱۳ بے دست و پا نفوس کی قلیل جماعت جہاں نہایت معمولی سامانِ جنگ اور ٹوٹے پھوٹے اسلحہ سے جنگ کی تیاری میں پورے عزم حوصلے اور ولولے کے ساتھ لگی ہوئی ہے وہاں کامیابی کی تمام امیدیں خدا ہی کی ذات سے وابستہ کئے ہوئے اُسی کی طرف متوجہ اور دست بدعا بھی ہے۔

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صِنْفَانِ مِنْ اُمَّتِیْ لَیْسَ لَہُمَا فِی الْاِسْلَامِ نَصِیْبٌ اَلْمُرْجِئَۃُ وَالْقَدَرِیَّۃُ (ہٰذا حدیث حسن)

حضرت ابنِ عباس نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری امت کے دو گروہ ایسے ہیں جن کا اسلام میں حصہ نہیں۔ مرجبہ اور قدریہ (یہ حدیث حسن ہے)

مرجبۂ:۔ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ بندوں کے تمام افعال قدرتِ الٰہی پر موقوف ہیں۔ بندوں کا ان میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس نظریے کے تحت مومن کی معصیت اس کو کوئی نقصانِ اخروی نہیں پہنچا سکتی جیسے کفر کی حالت میں اطاعت کوئی نفع بخش نہیں۔

قدریہ:۔ قدر کا انکار کرتے ہیں۔ انکا کہنا ہے کہ بندوں کے افعال خود ان کی قدرت پر موقوف ہیں قدرتِ الٰہی کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ نہ اس کے ارادے کا کوئی حق ہے۔

جاوید نامہ

مولانا رومؒ کی زبان سے اسرارِ معراج بیان کرتے ہیں ؎

شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق — خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق
پیشِ این نور ار بمانی استوار — حی و قائم چون خدا خود را شمار
مردِ مومن در نسازد با صفات — مصطفےٰ راضی نہ شد الا بذات
چیست معراج؟ آرزوے شاہدے — امتحانے روبروے شاہدے
شاہدِ عادل کہ بے تصدیقِ او — زندگی مارا چو گل را رنگ و بو
در حضورش کس نماند استوار — ور بماند ہست او کامل عیار

چیست تن؟ با رنگ و بو خو کردن است — با مقامِ چار سو خو کردن است
از شعور است این کہ گوئی نزد و دور — چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور

انقلاب اندر شعور از جذبِ شوق   وار ہاند جذبِ شوق از تحت و فوق

ایں بدن با جانِ ما انبار نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست

زروان، جو روحِ مکان و زمان ہے، اپنی تعریف کرتا ہے کہ ؎

آدم و فرشتہ در بندِ من است   عالمِ شش روزہ فرزندِ من است
ہر گلے کز شاخ می چینی منم   اُمّ ہر چیزے کہ می بینی منم
در طلسمِ من اسیر است ایں جہاں   از دمم ہر لحظہ پیر است ایں جہاں
"لی مع اللہ" ہر کرا در دل نشست   آں جوانمردے طلسمِ من شکست
گر تو خواہی من نباشم در جہاں   "لی مع اللہ" باز خواں از عینِ جاں

زندہ رود، رومی سے پیغمبری کی تعریف پوچھتا ہے۔ رومی جواب دیتے ہیں ؎

گفت اقوام و ملل آیاتِ اوست   عصر ہائے ما ز مخلوقاتِ اوست
از دمِ او ناطق آید سنگ و خشت   ما ہمہ مانندِ حاصل او چو کشت
پاک سازد استخوان و ریشہ را   بال جبریلے دہد اندیشہ را
ہائے و ہوئے اندرونِ کائنات   از لبِ اوئے انجم و نورد نازعات
آفتابش را زوالے نیست نیست!   منکرِ او را کمالے نیست نیست!
رحمتِ او صحبتِ احرارِ او   قہرِ یزداں ضربتِ کرارِ او
گرچہ باشی عقلِ کُل از وے مرم   زانکہ او بہ بندد تن و جاں را بہم

حضورؐ کی تعریف کس کس پیرایے میں اور کس جوش کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور تعریف کیا کرتے ہیں۔ حضور کی ایک بات پر دل و جان سے قربان جاتے ہیں۔ جس ادا کو دیکھتے ہیں دل ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ جس شان پر نگاہ پڑتی ہے جان نذر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور اسی پر بھی تعریف کا جو اسلوب اختیار کیا ہے اُس میں فرق نہیں آنے پاتا۔ نہ افراط ہے نہ —

تعریف بلکہ دینی اعتقاداں شروع سے آخر تک قائم ہے۔ اور واقعیت ہے کہ ہر جگہ موجود ہے۔ اور اس کے خلاف ہوتا بھی کس طرح جب کہ خود یہ احساس رکھتے ہیں کہ ؎

از تنک جامی ما میکدہ رسوا گردید
شیشۂ گیر و حکیمانہ بیاشام و برو

پھر عطارد پر پہنچتے ہیں تو وہاں نبوت کی چار طاسینیں دیکھتے ہیں۔ طاسین محمد میں روح ابو جہل کعبہ میں نوحہ کرتی نظر آتی ہے۔ اس کا نوحہ اقبال کی زبانی سنیئے ؎

سینۂ ما از محمد داغ داغ — از دم او کعبہ را گل شد چراغ
از ہلاک قیصر و کسریٰ سرود — نوجواناں را ز دست ما ربود
ساحر و اندر کلامش ساحری است — ایں دو حرفِ لا الٰہ خود کافری است
تا بساطِ دینِ آبا در نورد — با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد
پاش پاش از ضربتش لات و منات — انتقام از وے بگیر اے کائنات!
دل بہ غائب بست و از حاضر گسست — نقشِ حاضر را فسونِ او شکست
مذہب او قاطعِ ملک و نسب — از قریش و منکر از فضلِ عرب!
در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست!
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ — با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند — آبروئے دودمانے ریختند!
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است — خوب می دانم کہ سلماں اعجمی است
ابن عبداللہ فریبش خوردہ است — رستخیزے بر عرب آوردہ است!
عترتِ ہاشم ز خود مہجور گشت — از دو رکعت چشمِ شاں بے نور گشت
اعجمی را اصلِ عدنانی کجاست — گنگ را گفتارِ سحبانی کجاست!
چشمِ خاصانِ عرب گردید کور — بر نیائی اے زہیر از خاکِ گور!

اے تو مارا اندریں صحرا دلیل

بشکن افسون نوائے جبرئیل

باز گو اے سنگِ اسود باز گو | آنچہ دیدیم از محمدؐ باز گو

اے ھُبَل اے بندہ پوزش پذیر | خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر

گلۂ شاں را بگرگاں کن سبیل | تلخ کن خرمائے شاں را بر نخیل

صرصرے دہ با ہوائے بادیہ | اَنَّھُم اعجاز نخلٍ خاویہ

اے منات اے لات ازیں منزل مرو | گر ز منزل میروی از دل مرو

اے ترا اندر دو چشم ما وثاق

مہلتے ان کنت اُزمعت الفراق

اس جوشِ محبت کو دیکھئے کہ ابوجہل جیسے دشمنِ اسلام کی زبان سے حضورؐ کی تعریف کراتے ہیں۔ ایسی انوکھی تعریف کسی نے کہاں سُنی ہو گی! اور یوں دیکھئے تو یہ واقعی ابوجہل کے دل دل کی باتیں ہیں۔ یقیناً اس کا دل یہی کہتا ہو گا۔ کہ

"ہمارا سینہ محمدؐ کے ہاتھوں داغ داغ ہے۔ محمدؐ کے سے کعبہ کا چراغ گل ہو گیا۔ یہ قیصر و کسریٰ کے ہلاک کی باتیں کرتا ہے، ہمارے نوجوانوں کو ہم سے چھین لیا ہے، جادوگر ہے، اور اس کے کلام میں جادو ہے بلکہ یہ "لا الٰہ الا اللہ" کے دو کلمے ہی قیامت ہیں، ہمارے باپ دادا کے دین کی بساط کو الٹ دیا۔ اور ہمارے خداؤں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے۔ اس کی ضرب سے لات و منات کے ٹکڑے ہو گئے۔ اے کائنات! اس سے انتقام لے! دل کو غائب سے لگایا ہے اور حاضر سے ہٹا لیا ہے، بلکہ نقشِ حاضر کو اس کے افسوں نے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس کا مذہب ملک و نسب کا قاطع ہے۔ خود قریش سے ہے اور عرب کی فضیلت

کا منکر ہے! اس کی نگاہ میں بالا و پست برابر ہیں، اپنے غلام کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھتا ہے۔ اس نے احرارِ عرب کی قدر نہ جانی اور حبش کے بھونڈے بدشکلوں کے ساتھ موافقت کرلی ہے، احمر و اسود کو ایک کردیا ہے، اور اس طرح خاندان کی آبرو خاک میں ملادی ہے۔ یہ مواسلت اور یہ مواخات عجمی ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ سلمانؓ عجمی ہے ابنِ عبداللہ نے اس کے فریب میں آکر عرب کے سر پر ایک قیامت لا ڈالی ہے اور اولادِ ہاشم اپنی خودی سے غافل ہوگئی۔ یہ دو رکعت کیا پڑھیں ان کی آنکھیں اندھی ہوگئیں (کہ اپنے مقام کو بھی نہیں پہچانتیں)، بھلا عجمی کی اصل عدنانی کیوں کر ہو سکتی ہے! اور ایک گونگا فصاحت میں سحبان کی برابری کس طرح ... کرسکتا ہے! خاصانِ عرب اندھے ہوگئے ہیں۔ اے زہیر! خاکِ گور سے کیوں نہیں نکل آتا کہ اس صحرا میں تو ہمارا رہنما ہے آ۔ اور اس قرآن کے اثر کو باطل کردے۔ اے سنگِ اسود! جو کچھ ہم نے محمدؐ کے ہاتھوں دیکھا ہے تو بیان کر۔ اے ہبل! اے بندوں کی عرض و معروض سننے والے! اپنے گھر کو بے کیشوں سے خالی کرا۔ ان کے گلہ کو بھیڑوں کے حوالے اور ان کے درختوں پر کھجوروں کو تلخ کردے (ان پر عرصۂ حیات تنگ کردے۔ اور ....

اے منات! اے لات! یہ راستہ نہ چلو (ہم سے بے رخی اور دوری نہ اختیار کرو) اگر تم اس جگہ سے جاتے ہو تو ہمارے دلوں سے تو نہ جاؤ۔ تمہارا گھر ہماری ...

اقبالؒ نے ابوجہل کے دل کی انتہائی گہرائیوں میں چھپی باتوں کو

نکال کر منظرِ عام پر لا رکھا ہے۔ ابوجہل کے نزدیک ممکن ہے یہ حضورؐ اکرم کی مذمت ہو مگر حقیقت میں تعریف ہے۔ کیونکہ جن باتوں کو اُس نے قبائح کی فہرست میں شامل کیا ہے یہ وہ فضائل و محامد ہیں جن کی نشر و اشاعت کے لئے حضورؐ مامور ہوئے تھے۔ غرضکہ نگاہِ عشق و مستی سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ ایک عاشقِ رسولؐ کی بصیرت نے ان باتوں کو بھی دیکھ لیا جن کو ایک دشمن اسلام نے دل کے نہایت درجہ تاریک گوشوں میں چھپا رکھا تھا۔

زندہ رود فلکِ عطارد میں رُوحِ جمال الدینؒ افغانی سے ملاقات کرتا ہے اور اُن سے متعدد سوالات کرتا ہے۔ وہ ایک ایک سوال کا جواب دیتے ہیں زندگی کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

مصطفےٰؐ اندر حرا خلوت گزید   مدّتے جز خویشتن کس را ندید
نقشِ ما را در دلِ او ریختند   ملّتے از خلوتش انگیختند
می توانی منکرِ یزداں شدن   منکر از شانِ نبیؐ نتواں شدن

درویش سوڈانی ملّتِ عربیہ سے خطاب کرتا ہے اور اسلاف کے کارنامے یاد دلا کر ان کی غیرتِ خفتہ کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے اور موجودہ حالات پر غالب آنے کے لئے حضورؐ کا ارشاد یاد دلاتا ہے کہ ؎

از بلا ترسی؟ حدیثِ مصطفےٰؐ است
مرد را روزِ بلا روزِ صفات

حدیث شریف ہے:-

وثلاثٌ من کنوز البرّ۔ اخفاء الصدقۃ وکتمان المصیبۃ وکتمان الشکوی۔ یقول اللہ تعالیٰ اذا ابتلیتُ عبدی ببلیۃٍ فصبر علی ذالک ولم یشکو الی عوّادہ ابدلتہ لحماً خیراً من لحمہ ودماً خیراً من دمہ اذا ابرء اللمرض وان توفیتہ فالی رحمتی فان ابرأتہ ولا ذنب لہ۔

اعفو لجمیع ذنوبہ - تین چیزیں بھلائی کا خزانہ ہیں ۔ صدقہ ۔ مصیبت، اور شکایت کا چھپانا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب میں اپنے بندے کو مرض کے ذریعہ آزماتا ہوں اگر اس نے اس پر صبر کیا اور تیمارداروں سے شکایت نہیں کی تو میں اس کے گوشت پوست کو بہتر گوشت پوست سے بدل دیتا ہوں - اگر میں اسے اٹھا لیتا ہوں تو اپنی رحمت میں لیتا ہوں - اور اگر بیماری سے نجات دوں تو اس حال میں تندرست کرتا ہوں کہ اس کے تمام گناہ معاف کر دیتا ہوں -

غالب کہتے ہیں ؎

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است
رحمتہ للعالمینی انتہا ست

زندہ رود کہتا ہے ؎

من ندیدم چہرۂ معنی ہنوز
آتشے داری اگر، مارا بسوز!

غالب کی بجائے حلاج جواب دیتے ہیں ؎

یا ز نورِ مصطفےٰ اورا بہا ست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

زندہ رود سوال کرتا ہے ؎

از تو پرسم گرچہ پرسیدن خطا ست
سرّ آں جوہر کہ نامش مصطفےٰ است
آدمے یا جوہرے اندر وجود
آنکہ آید گاہے گاہے در وجود؟

حلاج جواب دیتے ہیں ؎

پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است
عبدہٗ از فہم تو بالاتر است
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است

جوہر او نے عرب نے انجم است — آدم است و ہم ز آدم اقدم است

عبدہٗ صورت گرِ تقدیر ہا — اندر و ویرانہ ہا تعمیر ہا

عبدہٗ ہم جاں فزا ہم جاں ستاں — عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگِ گراں

عبدہٗ دیگر عبدہٗ چیزے دگر — ما سراپا انتظار او منتظر

عبدہٗ با ابتدا بے انتہاست — عبدہٗ را صبح و شام ما کجاست

عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ ست — ما ہمہ رنگیم او بے رنگ و بوست

کس ز سرِ عبدہٗ آگاہ نیست — عبدہٗ جز سرِ الا اللہ نیست

لا الٰہ تیغ و دم او عبدہٗ — فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ

عبدہٗ چند و چگونِ کائنات — عبدہٗ راز درونِ کائنات

مدعا پیدا نگردد زیں دو بیت — تا نہ بینی از مقامِ ما رمیتُ

بگذر از گفت و شنود اے زندہ رود
غرق شو اندر وجود اے زندہ رود

زندہ رود دریافت کرتا ہے

کم شناسم عشق را ایں کار چیست
ذوقِ دیدار است پس دیدار چیست

حلاج جواب دیتے ہیں

معنی دیدار آں آخر زماں — حکم او بر خویشتن کردن رواں

در جہاں زی چوں رسولِ انس و جاں — تا چو او باشی قبولِ انس و جاں

باز خود را بیں ہمیں دیدار اوست — سنتِ او سرّے از اسرار اوست

حضورؐ کے دیدار سے آپ کے احکام پر عمل کرنا مقصود ہے۔ دنیا میں رسولِ انس و جان کی طرح زندگی بسر کرو تاکہ تم بھی اس کی طرح مقبولِ انس و جان ہو جاؤ۔ اس کے بعد اپنے آپ کو دیکھو یہ دیکھنا اس کا دیدار ہے۔ یعنی اس کی سنت میں اس کا راز پوشیدہ ہے۔

رومی کی زبان سے سلطان شہیدؒ (ٹیپو) کی تعریف کرتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ سلطانِ دکن تھا بلکہ اس لئے کہ عاشقِ رسولؐ تھا ؎

آں شہیدانِ محبت را امام | آبروئے ہند و چین و روم و شام
نامش از خورشید و مہ تابندہ تر | خاکِ قبرش از من و تو زندہ تر
عشق رازے بود بر صحرا نہاد | تو ندانی جاں چہ مشتاقانہ داد
از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین | فقرِ سلطاں وارثِ جذبِ حسینؓ

رفت سلطاں زیں سرائے ہفت روز
نوبتِ او در دکن باقی ہنوز

سلطان شہیدؒ زندہ رود سے مخاطب ہوتے ہیں ؎

اے ترا دادند حرفِ دل فروز | از تپِ اشکِ تو می سوزم ہنوز
کاروِ کاوِ ناخنِ مردانِ راز | جوئے خوں بکشاد از رگہائے ساز
آں نوا کز جانِ تو آید بروں | می زند ہر سینہ را سوزِ درون
بودہ ام در حضرتِ مولائے کل | آنکہ بے او طے نمی گردد سُبل
گرچہ آنجا جرأتِ گفتار نیست | روح را کارے بجز دیدار نیست
سوختم از گرمیٔ اشعارِ تو | بر زبانم رفت افکارِ تو
گفت ایں بیتے کہ بر خواند آں کیست؟ | اندرو ہنگامہ ہائے زندگی است

با جہاں سوزے کہ در سازد بجاں | یک دو حرف از ما بہ کاویری رساں
در جہاں تو زندہ رود او زندہ رود
خوشتر آید سرود اندر سرود

سلطان شہیدؒ زندہ رود سے فرماتے ہیں۔ اللہ نے تجھ کو تاثیرِ کلام کی دولت عطا کی ہے۔ تیرے اشعار کی گرمی سے میں اب تک جل رہا ہوں۔ وہ آواز جو تیرے دل سے نکلتی ہے ہر دل میں سوزِ

محبّت پیدا کرتی ہے ہیں مولائے گُل کے حضور میں موجود تھا، وہ کہ جس کے بغیر دین کا راستہ طے نہیں ہوتا، اگرچہ وہاں کسی کی جراٴتِ گفتار نہیں ہے اور رُوح کو دیدار کے سوا کوئی کام بھی نہیں ہوسکتا۔ مگر تیرے اشعار سے میں ایسا متاثر ہوا کہ بیساختہ میری زبان پر آگئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ اشعار جو تو نے پڑھے کس کے ہیں؟ ان میں ہنگامہ ہائے زندگی پوشیدہ ہیں۔

اس کے بعد سلطان شہیدؒ فرماتے ہیں کہ اسی سوز کے ساتھ جو رُوح میں پیوستہ ہوتا ہے ہماری طرف سے دو ایک باتیں دریائے کاویری کو پہنچادے۔ دنیا میں تو بھی زندہ رود ہے اور وہ بھی زندہ رود ہے۔ اور سرور اندر سرود بڑے لطف کی چیز ہے۔

"خطاب بہ جاوید" میں فرزند کو نصیحت فرماتے ہیں جو اصل میں تمام نئی نسل کے لئے ہے ؎

دیں سراپا سوختن اندر طلب ۔۔۔ انتہایش عشق و آغازش ادب
آبروئے گُل ز رنگ و بوئے اوست ۔۔۔ بے ادب، بے رنگ و بوئے آبروست
نوجوانے را چو بینم بے ادب ۔۔۔ روزِ من تاریک می گردد چو شب
تاب و تب در سینہ افزاید مرا ۔۔۔ یادِ عہدِ مصطفیٰؐ آید مرا!
از زمانِ خود پشیماں می شوم ۔۔۔ در قرونِ رفتہ پنہاں می شوم
سترِ زن یا زوج یا خاکِ لحد ۔۔۔ سترِ مرداں حفظِ خویش از یارِ بد

آخر میں فرماتے ہیں ؎

اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب ۔۔۔ تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب
سرِ دینِ مصطفیٰؐ گویم ترا
ہم بہ قبر اندر دعا گویم ترا

مثنوی مسافر

نادر شاہ (بادشاہ افغانستان) کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

فقر و شاہی واردات مصطفےٰ است
این تجلی ہائے ذات مصطفےٰ است

این دو قوت از وجود مومن است
این قیام و آں سجود مومن است

اقوام سرحد سے خطاب کرتے ہیں ؎

اے ز خود پوشیدہ خود را باز یاب
در مسلمانی حرام است این حجاب

رمز دین مصطفےٰ دانی کہ چیست؟
فاش دیدن خویش را شہنشہی ست

چیست دیں؟ دریافتن اسرار خویش
زندگی مرگ است بے دیدار خویش

حکیم سنائی کے مزار پر حاضر ہوتے ہیں تو ان سے سوال کرتے ہیں کہ اسرار غیب سے جو کچھ آپ پر منکشف ہے بیان کیجئے۔ روح حکیم جواب دیتی ہے ؎

مومناں زیر سپہر لاجورد
زندہ از عشق اند و از خواب و خورد

می ندانی عشق و مستی از کجاست؟
این شعاع آفتاب مصطفےٰ است

باخبر شو از دو روز آب و گل
پس بزن بر آب و گل اکسیر دل

مصطفےٰ بحر است و موج او بلند
خیز و این دریا بجوئے خویش بند

تو تہ بر ساحلش پیچیدۂ
لطمہ ہائے موج او نادیدۂ

یک زماں خود را بدریا در فگن
تا روان رفتہ باز آید بہ تن

قندھار جاتے ہیں اور وہاں حضورؐ کے خرقۂ مبارک کی زیارت کرتے ہیں تو خرقۂ مبارک کی تعریف جن الفاظ میں کرتے ہیں۔ ایک ایک لفظ سے محبت ٹپکتی ہے ؎

خرقۂ آں "برزخ لا یبغیان" — دیدمش در نکتۂ "لی خرقتان"

دین او آئینِ او تفسیرِ او — در جبینِ او خطِ تقدیرِ او

عقل را او صاحبِ اسرار کرد — عشق را او تیغِ جوہر دار کرد

کاروانِ شوق را او منزل است — ما ہمہ یک مشتِ خاکیم او دل است

آشکار او پنہانش اسرائے ما — در ضمیرش مسجدِ اقصائے ما

آمد از پیراہنِ او بوئے او
داد مارا نعرۂ اللہ ھو

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق"

فقر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

مومناں را گفت آں سلطانِ دیں — مسجدِ ما ایں ہمہ روئے زمیں

الاماں از گردشِ نہ آسماں — مسجدِ مومن بدستِ دیگراں

سخت کوشد بندۂ پاکیزہ کیش — تا بگیرد مسجدِ مولاؐ ئے خویش

ای کہ از ترکِ جہاں گوئی مگو — ترکِ ایں دیرِ کہن تسخیرِ او

راکبش بودن از و وارستن است — از مقامِ آب و گل بر جستن است

تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن — اے مسلماں مردن است ایں زیستن!

مردِ حق باز آفریند خویش را — جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را

بر عیارِ مصطفیٰؐ خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد — می شناسی عصرِ ما با ما چہ کرد؟

عصرِ ما مارا ز ما بیگانہ کرد — از جمالِ مصطفیٰؐ بیگانہ کرد

سوزِ او تا از میانِ سینہ رفت   جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت

کہتے ہیں مسلمان ذوق و شوق اور سوز و درد سے خالی ہو گیا۔ اس کو یہ بھی خبر نہیں کہ عصرِ حاضر نے اس کو جمالِ مصطفےٰؐ سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اور ذوق و شوق اور سوزِ عشقِ مصطفےٰؐ اس کے سینے سے کیا رخصت ہوا! جوہرِ آئینہ آئینہ سے جاتا رہا۔ اب یہ نام کا مسلمان ہے مگر مسلمان کے مقام سے کوسوں دور ہے۔

"در اسرارِ شریعت" کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

مال را اگر بہرِ دیں باشی حمول   "نعم مال صالح" گوید رسولؐ

گر نداری اندریں حکمت نظر   تو غلام و خواجۂ تو سیم و زر

از تہی دستاں کشادِ اُمتاں   از چنیں منعم فسادِ امتاں

اے خوشا منعم کہ چوں درویش زیست!

در چنیں عصرے خدا اندیش زیست!

شرع می خیزد ز اعماقِ حیات   روشن از نورش ظلامِ کائنات

گر جہاں داند حرامش را حرام   تا قیامت پختہ ماند ایں نظام

حکمتش از عدل و تسلیم و رضاست   بیخِ او اندر ضمیرِ مصطفےٰؐ است

از فراقش آرزو ہا سینہ تاب   تو نمانی چوں شود او بے حجاب

بالِ جبریل

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں   کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سر خود را

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے   غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر   وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

معراجِ مصطفےؐ ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

ضربِ کلیم ۔ معراج

تاوک ہے مسلماں ہدف اس کا ہے ثریا | ہے سرِ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج!
تو معنیِ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا | ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

ایک فلسفہ زدہ سید زادے سید کو لکھتے ہیں ؎

دل در سخنِ محمدیؐ بند
اے پورِ علیؓ ز بوعلی چند

ایک نظم بعنوان "اے روحِ محمدؐ" لکھی ہے۔ حضورؐ سے عرض کرتے ہیں مگر

اپنا دُکھ درد نہیں بلکہ یہ کہ ؎

شیرازہ ہوا ملّتِ مرحوم کا ابتر! | اب تو ہی بتا تیرا مسلماں کدھر جائے!
وہ لذّتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں | پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفاں کدھر جائے!
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد | اس کوہ و بیاباں سے حدی خواں کدھر جائے!

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہباں کدھر جائے

اشعارِ بالا سے اقبالؔ کے عشقِ رسولؐ، اُن کی شیفتگی و فریفتگی کا کسی قدر اندازہ ہوگیا اور اُن کے محبوبؐ کی اُن ادائوں کا بھی پتہ چل گیا جو اُن کی دلبری کا باعث ہوئیں اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ عشقِ رسولؐ سے اُن کی مراد کیا ہے۔ یہاں تک اُن کی تقریباً تمام تصانیف ختم ہوجاتی ہیں اور ہم اشاعت کی ترتیب سے اُن کے عشق کا ارتقائی جائزہ لے چکے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے۔ کہ جو شرارۂ عشق اُن کے سینہ میں پیدا ہوا تھا کس طرح ترقی کرتا گیا اور یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ تقلیدی عاشق نہ تھے بلکہ انھوں نے اُس "انسانِ کاملؐ" میں وہ صفات دیکھی تھیں جو آدم سے لیکر آج تک کسی انسان میں جمع نہ ہو سکیں۔ اور یہ وہ صفات ہیں جو نوعِ انسانی کے لئے سراپا رحمت و رافت ثابت ہو چکی ہیں۔ اور اُن عالمگیر ابدی امکانات کی حامل ہیں کہ جب اور جہاں کہیں بھی انسان اُن کی رہنمائی میں زندگی گذارے گا۔ اپنے آپ کو اطمینانِ روح، طمانیتِ خاطر اور حقیقی مسرتوں کی دنیا میں پائے گا۔

اب ہم ان کی کتاب "ارمغانِ حجاز" پر آجاتے ہیں جو بالکل آخری اور اس زمانے کی تصنیف ہے کہ جب وہ حج کا ارادہ کر چکے تھے۔ اور زیارتِ حرمین شریفین کے لئے بیتاب تھے۔ ایسے بیتاب کہ اُٹھتے بیٹھتے اُسی ارضِ پاک کا ذکر زبان پر رہتا تھا۔ اور یہ اشعار بھی جن کا مجموعہ ارمغانِ حجاز ہے وہیں کے لئے لکھ رہے تھے۔ اس کتاب میں ان کا عشق دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ اس لئے اب وہ حضورؐ سرورِ کائنات کے متعلق تمام مدارجِ یقین طے کر کے حق الیقین کے درجے میں پہنچ گئے ہیں۔ غرض۔ اس زمانے کے عشق کی کیفیات کو بھی ملاحظہ فرمایئے مگر ساتھ ہی اشعار کے آئینوں میں اپنی اور اپنی قوم کی حالت بھی دیکھتے جایئے کہ اقبالؔ دیوانۂ عشق ضرور ہے مگر اپنے کام میں ہوشیار بھی بلا کا ہے۔

انتقال سے دس پندرہ منٹ پہلے جو رباعی زبان پر تھی اور جس کی شہرتؔ عالمگیر ہو چکی ہے اس کے ذریعہ یہ راز اچھی طرح فاش ہو گیا کہ نسیمِ حجازی اُن کو پیغامِ دوست لاتی تھی۔ اور وہ اس پیغام کی ترجمانی شعر کے ذریعہ کیا کرتے تھے — یعنی اُن کے اشعار میں جو بجلیاں... کوندتی نظر آتی ہیں اُن کا تعلق اُسی وادیٔ ایمن سے ہے جس کو "حجازِ مقدس" کہتے ہیں ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید

روزِ حشر کے حساب کا خیال آتا ہے تو عذابِ دوزخ کا اندیشہ نہیں بلکہ یہ خیال پریشان کرتا ہے کہ اگر وہ حساب حضورؐ کے روبرو ہوا تو بڑی رسوائی ہو گی! حضورؐ کو کیا منہ دکھلاؤں گا! اس لئے خدا سے التجا کرتے ہیں کہ جس دن ہر پوشیدہ تقدیر بے نقاب ہو تو مجھے حضورِ خواجہؐ رسوا نہ کر۔ میرا حساب حضورؐ کی نگاہ سے پوشیدہ لینا ؎

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر — شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہؐ مارا — حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

یہاں بھی اپنے حساب سے اپنی رسوائی سے پہلے قوم کی رسوائی کا خیال آتا ہے۔ ورنہ تیسرے مصرع میں "مارا" کے کیا معنی!

اس تصور سے کہ مکّہ سے فارغ ہو کر مدینہ روانہ ہو رہے ہیں۔

فرطِ شوق میں خدا سے کہتے ہیں ؎

بدن واماندہ و جانم در تگ و پوست | سوئے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش اینجا و با خاصاں بیامیز | کہ من دارم ہوائے کوچۂ دوست

کتاب کا دوسرا حصّہ "حضورِ رسالت" شروع کرنے سے پہلے عزّت بخاری کا یہ شعر نقل کرتے ہیں ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

چونکہ یہ سفر پیری میں اختیار کر رہے ہیں اس لئے تمثیل کس قدر مؤثر و دل گداز ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم | نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام | کشاید پر بفکرِ آشیانہ

صحرائے حجاز میں مدینہ کی طرف قافلے چلے جا رہے ہیں۔ قافلے والے اُونٹوں کو بھی ہنکاتے ہیں اور درود بھی پڑھتے جاتے ہیں۔ کیسا پیارا منظر ہے! ایک مسلمان کو یہ منظر دیکھنا نصیب ہو جائے تو پھر اور کیا چاہئے! کہتے ہیں اے مسافر! اس صحرا کی گرم ریت پر سجدے کر۔ اور یہاں تک کر کہ ریت کی گرمی سے پیشانی پر جلنے کا نشان باقی رہ جائے ؎

چہ خوش صحرا کہ در وے کارواں ہا | درودے خواند و محمل براند
بہ ریگِ گرمِ او آور سجودے | جبیں را سوز تا داغے بماند

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است | شبش کوتاہ و روزِ او بلند است

قدم اے راہرو آہستہ تر نہ　　　　چو ما ہر ذرۂ او درد منداست

ذرا عاشقانِ رسولؐ اس رُباعی کو پڑھیں! نالہ وفغاں کرنے اور آنکھوں کو قدموں سے ملنے کی تمنّا ہے مگر اس کام میں دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں اس لئے یہ نالہ وفغاں سرورِؐ کائنات کے حضور میں کر رہے ہیں اور یہ قدم بوسی خواجۂؐ دو جہاں کی نصیب ہو رہی ہے! ؎

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم　　　　من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مُرادِ دل بگوئیم　　　　بپائے خواجۂ چشماں را بمالیم

کہتے ہیں حکیموں اور فلسفیوں کو نہیں پوچھا گیا۔ اس لئے کہ یہاں دردِ دل، سوزِ جگر اور بہرِ اللہ کا فضل وکرم چاہیئے یہی وجہ ہے کہ ایک نادان کو (اپنی طرف اشارہ ہے) جلوۂ مستانۂ دوست سے نوازا جا رہا ہے! کیا نصیب ہے اور کتنا اچھا وقت ہے! کہ شہنشاہِ کونینؐ کا دروازہ ایک ادنٰی درجے کے فقیر کے لئے کھولا جا رہا ہے! ؎

حکیماں را بہا کمتر نہادند　　　　بنا داں جلوۂ مستانہ دادند
چہ خوش بختے، چہ خورم روزگارے　　　　درِ سُلطاں بدرویشے کشادند

مدینہ میں فانی انسان عشقِ نبیؐ کی بدولت جاودانی ہو جاتا ہے۔ یہاں کی خاک سے بغیر شعور کے معانی اُگتے ہیں۔ براہِ راست دلوں میں اسرار و رموز کا القا ہوتا ہے۔ حکیم ہو خواہ کلیم سب کے دلوں پر انوار و تجلیات کا فیضان ہوتا ہے۔ یہاں سے کوئی محروم نہیں جاتا۔ اس لئے کہ یہاں لن ترانی ہیں۔ کسی کو جواب نہیں ملتا ؎

دریں وادی زمانی جاودانی — ز خاکش بے صُور روید معانی
حکیماں با کلیماں دوش بر دوش — کہ اینجا کس نگوید لن ترانی

حضورؐ سے عرض کرتے ہیں کہ مسلمان جو فقیری و بادشاہی دونوں کا مالک تھا، اس کا دل سوزِ محبت سے خالی ہو چکا ہے نالے کرتا ہے مگر نہیں جانتا کہ کیوں کرتا ہے (مصیبت میں ہے مگر ساتھ ہی کوئی مقصدِ حیات اپنے سامنے نہیں رکھتا کہ یہ رونا دھونا مقصد کے لئے ہو۔ پس یونہی روتا ہے ظاہر ہے کہ یہ انتہائی پستی کا مقام ہے) لیکن حضورؐ آپ اس کی نادانی پر نہ جائیے بلکہ اس کو ایک نگاہِ کرم سے نواز دیجیے۔ حضورؐ کی نگاہِ کرم سے اس کی تمام مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مسلماں آں فقیرے کج کلاہے — رمید از سینۂ او سوزِ آہے
دلش نالد چرا نالد؟ نداند — نگاہے یا رسول اللہؐ نگاہے

عرض کرتے ہیں کہ میرے دل کی بے قراری حضورؐ ہی کے سوزِ غم سے ہے اور میری شاعری بھی حضورؐ ہی کے دم (فیضانِ روحانی) کی تاثیر کا نتیجہ ہے۔ اگر روتا ہوں کہ آج سارے ملک میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو آپ کا محرم ہو (یعنی آپؐ کے مقصدِ نبوت کو سمجھنے والا ہوتا تو اقبالؔ کے پیغامِ حیات کو جو قرآنِ کریم کی تعلیمات پر مبنی ہے، اور حضورؐ ہی کی آواز ہے۔ یہ کہنے کی جرأت کون کر سکتا تھا ؎

گفت برما بند و افسونِ فرنگ
ہست غوغائیش ز قانونِ فرنگ

رُباعی ؎

تب و تابِ دل از سوزِ غم تست | نوائے من ز تاثیر دمِ تست
بنالم زانکہ اندر کشورِ ہند | ندیدم بندۂ کو محرمِ تست

عرض کرتے ہیں حضورؐ ہندی مسلمانوں کا بہت بُرا حال ہے۔ آپؐ کی نگاہِ کرم کے سب سے زیادہ مستحق ہیں! اس لئے کہ آج ایشیا میں ان سے زیادہ بیچارہ و درماندہ کوئی نہیں ہے ؎

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست | بایں خاک آفتابے را گذر نیست
بما کن گوشۂ چشمے کہ در شرق | مسلمانے ز ما بیچارہ نیست

اُس فقیرِ دردمند یعنی مسلمان کا حال کیا عرض کروں جو اصلاً ارجمند ہے! خدا اس سخت جان کے حال پر رحم کرے کہ بے چارہ بہت اونچے مقام سے گرا ہے۔ اس کے احوال کو کس طرح لب پر لاؤں۔ آپ تو میرے ظاہر و باطن کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کے دو سو سالہ رُوداد کا اندازہ اس سے فرما لیجئے کہ اس رُوداد نے میرا دل ایسا کر دیا ہے جیسا کہ کندۂ قصاب ؎

چہ گویم زاں فقیرے دردمندے | مسلمانے بگوہر ارجمندے
خدا ایں سخت جاں را یار بادا | کہ افتاداست از بامِ بلندے

چساں احوالِ او را بر لب آرم | تو می دانی نہان و آشکارم
ز رودادِ دو صد سالش ہمیں بس | کہ دل چوں کندۂ قصاب دارم

اور ابھی تو آسمان اس کے ساتھ دشمنی پر تلا ہوا ہے۔ ابھی اس کی مصیبتوں کا خاتمہ ہوا کب ہے! اس کے کام کی ابتری آپؐ سے کیا عرض کروں۔

آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ اس کا ایک ہی سبب ہے اور وہ یہ کہ ان کا کوئی امام (لیڈر) نہیں ہے ۔ ایک بے سری فوج ہے ۔

اقبال نے ایک خط میں چودھری نیاز علیخاں (بانیٔ ادارہ دارالسلام پٹھان کوٹ) کو ۲ جولائی ۳۷ء کو لکھا تھا "اسلام کے لئے اس ملک میں .... نازک زمانہ آ رہا ہے ۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے اُن کا فرض ہے کہ اس کی .... حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش کریں ۔ انشاء اللہ آپکا ارادہ اس مقصد کو باحسنِ وجوہ پورا کرے گا ۔ علماء میں مداہنت آگئی ہے ۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے ۔ صوفیہ سب سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں ۔ اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں ۔ اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں ۔ عوام میں جذبہ موجود ہے ۔ لیکن ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں ہے ؎" ذیل کی رباعی میں بھی حضورؐ سے اسی بات کی شکایت کی ہے ؎

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است — ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
زکارِ بے نظامِ او چہ گویم — تو می دانی کہ ملت بے امام است

مسلمان کے خون میں پہلے کی سی حرارت نہیں رہی ۔ اور اب اس کی کشتِ خراب سے لالہ بھی نہیں اگتا ۔ یعنی اس کے خون میں بھی حرارت نہیں ہے اور اس کے دل میں بھی داغِ عشق و محبت نہیں ہے ۔ میان تلوار سے خالی ہے اور جیب زر سے ۔ بزدل بھی ہوگیا اور مفلس بھی ۔ رہا قرآن مجید سو اس کو اپنے خانۂ ویراں کے طاق میں رکھ دیا ہے مگر اب اس کی ضرورت ہی نہیں رہی ! ؎

؎ مکاتیب اقبال صفحہ ۳۰

نماند آں تاب و تب در خونِ نابش
نروید لالہ از کشتِ خراب است
نیامِ او تہی چوں کیسۂ او
بطاقِ خانۂ ویراں کتابش

عرض کرتے ہیں حضورؐ! ہندی مسلمانوں کا حق دیجئے۔ یہ آپ سے خیرات مانگتے ہیں۔ اور خیرات کے مستحق ہیں۔ اس لئے کہ مسکین بھی ہیں، فقیر بھی ہیں اور اسیر بھی اور ایک اور وجہ سے بھی یہ آپ کے کرم کے مستحق ہیں۔ وہ یہ کہ ان کی غیرت نہیں مری ہے۔ کتنے ہی خراب و خستہ ہو گئے، مگر غیرت دینی اب بھی ویسی ہی رکھتے ہیں اور اس دینی غیرت ہی کی وجہ سے کسی نہ کسی طرح زندگی گذار رہے ہیں۔

حقِ آں دہ کہ مسکین و اسیر است
فقیر و غیرتِ او دیر میر است
بروئے او درِ میخانہ بستند
دریں کشور مسلماں تشنہ میر است

حضورؐ! مسلمان کے دل کو پاک کر کے پھر اس میں جہانِ (مقاصد) پیدا کر دیجئے۔

زمانے کی ہوا بہت تیز ہے اور اس کے دامن میں سینکڑوں سوراخ اس چراغِ بسمل کی آپ ہی حفاظت فرمائیں گے۔ (حوادث نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور یہ بدستور برائیوں میں مبتلا ہے اور ایک دو نہیں سینکڑوں برائیوں میں! ایسی صورت میں آپ توجہ نہ فرمائیں گے تو اس کی عزت کا چراغ کس طرح روشن رہ سکے گا!)

دگر پاکیزہ کن آب و گلِ او
جہانے آفریں اندر دلِ او
ہوا تیز و بدامانش دو صد چاک
بہ بیند ریش از چراغِ بسملِ او

ملوکیت سراسر فریب ہے۔ اور اس فریب سے نہ روم محفوظ ہیں نہ حجازی۔ اس لیے حضور سے مسلمانوں کی مصیبت عرض کرتا ہوں۔ اور اس امید پر عرض کرتا ہوں کہ حضور کی اتباع میں ملوکیت کو لعنت سمجھنا چاہیئے تھا مگر کیسے غضب کی بات ہے کہ ملوکیت کا مٹانے والا خود ملوکیت کا دلدادہ ہوگیا! اور اس وجہ سے یہ دبا روم ہی میں نہیں حجاز میں موجود ہے۔ ایسی صورت میں پھر حضور ہی کی توجہ درکار ہے تاکہ اس بلا کے پنجۂ استبداد سے دنیا کو نجات ملے! ؎

ملوکیت سراپا شیشہ بازی ست　　　ازو ایمن نہ رومی نے حجازی ست
حضورِ تو غمِ یاراں بگویم　　　بامیدے کہ وقتِ دلنوازی ست

عرض کرتے ہیں کہ حضور مجھ سے نہ پوچھئے مسلمان کا کیا حال ہے! اس کی دنیا بھی خراب ہے اور آخرت بھی۔ اور کس قدر رونے کا مقام ہے کہ جس مرغ کو حضورؐ نے انجیر کھلا کر پالا تھا۔ آج اُس کو صحرا میں دانہ بھی تلاش گراں ہے (یعنی جس کو حضورؐ نے اپنی تعلیم سے محنتی، جفاکش اور سختیوں کا مقابلہ کرنے والا بلند حوصلہ بنایا تھا آج وہ ایسا پست فطرت اور تن آسان ہوگیا ہے کہ اس سے اپنی روٹی بھی نہیں کمائی جاتی) ؎

مپرس از من کہ احوالش چسان است　　　زمینش بدگہر چوں آسماں است
براں مرغے کہ پروردی با نجیر　　　تلاش دانہ در صحرا گراں است

میں نے مسلمان کے آگے اسرارِ زندگی کھول کر رکھ دیئے اور اس کو ماضی و مستقبل کے حقائق بھی سمجھا دیئے (کہ ماضی کیوں شاندار تھا اور مستقبل کس طرح باقبال ہو سکتا ہے)۔ اسرارِ زندگی اس سے بھی زیادہ واضح طریق پر بیان کیئے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ اس عجمی کو نطقِ عرب مرحمت فرمادیں (اقبال نطقِ عرب بھی مانگتے ہیں تو اسرارِ حیات بیان کرنے کے لیئے تاکہ قوم کی بے حسی دور کر سکیں) ؎

بہ چشمش وانمودم زندگی را | کشودم نکتۂ فردا و دی را
توان اسرارِ جاں را فاش تر گفت | بدہ نطقِ عرب ایں اعجمی را

لادینی اور الحاد نے دُنیا کو کیا سے کیا کر دیا ہے! مغرب کی مہذّب دُنیا کے رہنے والے رُوح کو مادّے سے بالاتر کوئی چیز نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ انسان صرف سالماتِ مادی کے امتزاج کا نام ہے اور رُوح بھی مادّے ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے جو جسم کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہے۔ اس لیئے یہ لوگ نہ معاد کے قائل ہیں نہ جزا و سزا کے مسلمان جس کا کام تھا اس الحاد کو ختم کرنا وہ وقفِ تن آسانی ہو کر رہ گیا۔ اس لئے اُس فقر میں سے جو حضورؐ نے صدیقِ اکبرؓ کو عنایت فرمایا تھا۔ موجودہ دَور کے مسلمانوں کو بھی عنایت فرمادیجئے۔ تاکہ ان میں پھر زندگی پیدا ہو کہ ان کے سوا اور کوئی اس الحاد کو ختم نہیں کر سکتا ؎

دگرگوں کرد لادینی جہاں را | ز آثارِ بدن گفتند جاں را
ازاں فقرے کہ صدیقؓ را دادی | بشورے آور ایں آسودہ جاں را

ہم غیراللہ کے آگے پیشانی گھستے اور آتش پرستوں کی طرح تعریف کے

گیت گاتے ہیں۔ حضورؐ! میں کسی اور کی شکایت نہیں کرتا خود اپنی شکایت کرتا ہوں۔ کہ ہم آپ کے شایانِ شان ہرگز نہ تھے (بھلا آپؐ کی امت اور غیر اللہ کے آگے جبیں سا اور ستائش گر!) ؎

جبیں را پیشِ غیر اللہ سودیم   چو گبران در حضورِ او سرودیم
ننالم از کسے، می نالم از خویش   کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم

گہے افتم گہے مستانہ خیزم   چہ خوں بے تیغ و شمشیرے بریزم
نگاہِ التفاتے بر سرِ بام   کہ من با عصرِ خویش اندر ستیزم

مجھے تنہائی میں آہ و فغاں کرنے میں مزا آتا ہے۔ اس لئے مدینہ کی طرف بے کارواں سفر کرنا میرے لئے اچھا ہے۔ بھلا کہاں مکتب اور کہاں میخانۂ شوق! حضورؐ ہی فرمائیں میرے لئے یہ اچھا یا وہ اچھا! ؎

مرا تنہائی و آہ و فغاں بہ   سوئے یثرب سفر بے کارواں بہ
کجا مکتب کجا میخانۂ شوق   تو خود فرما مرا ایں بہ کہ آں بہ

میں نے جو اسرار بیان کئے اُن کو یہ نہ سمجھ سکے۔ اس لئے میرے کلام سے ان کو نفع نہ ہوا۔ مگر اے میرے امیرؐ! آپؐ سے فریاد ہے کہ لوگوں نے مجھے غزل خواں سمجھ لیا ؎

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند   ز شاخِ نخلِ من خرما نہ خوردند
من اے میرِ اممؐ داد از تو خواہم   مرا یاراں غزل خوانے شمردند

حضورؐ کا حکم تھا کہ حیاتِ جاوداں کے اسرار بیان کر۔ اور مُردوں کے کان میں زندگی کا پیغام پہنچا۔ (میں نے حضورؐ کے حکم کی تعمیل میں زندگی ہی کے اسرار بیان کئے۔) مگر یہ ناحق شناس مسلمان زندگی کے اسرار معلوم کرنے کی بجائے مجھ سے کہتے ہیں کہ این و آں کی تاریخِ وفات لکھ۔ یعنی ان کو موت ہی کے معاملات سے دلچسپی ہے ؎

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوئے | بگوشِ مُردۂ پیغامِ جاں گوئے
ولے گویند ایں ناحق شناساں | کہ تاریخِ وفاتِ ایں و آں گوئے

میں نے خود شناس مسلمان کو خودی سے آشنا کیا۔ گویا اس خاک میں زمزم کا چشمہ جاری کر دیا۔ آپ مجھے وہ نالۂ گرم عطا کر دیجئے کہ اس کے دل سے غمِ دین کے سوا تمام غموں کو جلا دوں ؎

جودی دادم ز خود نامحرمے را | کشادم در گلِ او زمزمے را
بدہ آں نالۂ گرمے کہ از وے | بسوزم جز غمِ دیں ہر غمے را

میں موجِ ہوا سے آب و رنگ حاصل نہیں کرتا۔ بلکہ حضورؐ کے آفتاب فیض سے نمو پاتا ہوں۔ اسی لئے میری نگاہ ماہ و پروین سے بلند ہے۔ اور میں کسی کے مزاج کو دیکھ کر شعر نہیں کہتا۔ کوئی خوش ہو یا ناخوش حق بات کہتا ہوں۔ (جو کسی کی مدد کے سہارے رہتے ہیں وہی دوسروں کی مرضی کے شعر کہتے ہیں)۔

نم و رنگ از دمِ بادے نجویم | ز فیضِ آفتابِ تو بروئیم
نگاہم از مہ و پروین بلند است | سخن را بر مزاجِ کس نگویم

دریائے عشق جو ناپیدا کنار ہے۔ اس میں عشّاق کا رہنماؤں کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ جدھر دل لے جاتا ہے عشّاق اُسی طرف جاتے ہیں۔ چونکہ آپکا حکم ہے اس لئے بطحا کا راستہ اختیار کیا ہے ورنہ ہماری منزل تو آپؐ ہیں اور دل آپؐ ہی کی طرف لے جا رہا ہے ۔

درآں دریا کہ اورا ساحلے نیست | دلیلِ عاشقاں غیر از دلے نیست
تو فرمودی رہ بطحا گرفتیم | وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست

مراں از در کہ مشتاقِ حضوریم | ازاں دردے کہ دادی ناصبوریم
بفرما ہرچہ می خواہی بہ جز صبر | کہ ما از وے دو صد فرسنگ دوریم

فقیر ہوں، مگر جو کچھ مانگتا ہوں۔ آپؐ سے مانگتا ہوں۔ میرے برگ کاہ سے پہاڑ کے دل کو زخمی کر دیجئے (میرے معمولی اشعار میں وہ تاثیر بھر دیجئے کہ اُن سے سخت سے سخت دل بھی پگھل جائیں)، فلسفیوں کی تعلیم میرے لیۓ دردِ سر کا باعث ہوئی۔ اس لیۓ کہ میں فیضِ نگاہ کا پروردہ ہوں (خاندان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا ذکر آغاز کتاب میں کیا جا چکا ہے)۔

فقیرم از تو خواہم انچہ خواہم | دلِ کوہ ہے خراشد از برگ کاہم
مرا درسِ حکیماں دردِ سر داد | کہ من پروردۂ فیضِ نگاہم

نہ با ملّا نہ با صوفی نشینم | کہ تو دانی کہ من آنم نہ اینم
نویسِ اللہ بر لوحِ دلِ من | کہ ہم خود را ہم او را فاش بینم

منبر پر ملا کی تقریر بڑی بیشدار ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی بغل میں سینکڑوں کتابیں ہیں میں نے حضورؐ کے آگے شرم سے عرض نہیں کیا ہے۔ ورنہ حضورؐ! اس کو اپنی خبر نہیں اور ہماری فکر ہے۔ خودشناس اگر خودنما ہو تو ایک حد تک مناسب بھی ہے مگر یہ خودشناسی سے کوسوں دُور ہوئے خودنمائی کے لئے منبر پر رہو اں دھار تقریریں کرتا ہے ؎

سرِ منبر کلامش نیش دار است
کہ او را صد کتاب اندر کنارش
حضورِ تو من از خجلت نہ گفتم
زخود پنہاں و بر ما آشکار است

میری آنکھوں میں آپؐ ہی کی عطا کردہ روشنی ہے (یہ ایمانی بصیرت آپؐ ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے) اور جبکہ آپؐ نے میری رات کو فروغِ ماہ سے روشن کیا ہے تو پھر مجھے صبح من رآنی کا جلوہ بھی دکھلا دیجئے۔ یعنی ان... مشتاق نگاہوں کو اپنے دیدار سے منور کر دیجئے ؎

بہ چشمِ من نگہ آوردۂ تست
فروغِ لا الٰہ آوردۂ تست
دو چارم کن بہ صبحِ من رآنی
شبم را تابِ مہ آوردۂ تست

مَنْ رَآنِیْ فَقَدْ رَاَ اللّٰہ: جس نے مجھے دیکھا اس نے اللہ کو دیکھا۔ (حدیث شریف)

جب میں نے خود کو ہر طرف سے سمیٹ کر معرفتِ نفس کی طرف لگا دیا اور حضورؐ کی عطا کردہ روشنی میں اپنے آپ کو دیکھا تو اپنی نگاہ صبح گاہی سے دنیا میں عشق و مستی کا ایک جہاں پیدا کر دیا ؎

چو خود را در کنارِ خود کشیدم
بہ نورِ تو مقامِ خویش دیدم
دریں دیر از نوائے صبح گاہی
جہانِ عشق و مستی آفریدم

گلستانے ز خاکِ من برانگیز — نم چشم بخونِ لالہ آمیز
اگر شایاں نیم تیغِ علیؓ را — نگاہے دہ چو شمشیرِ علیؓ تیز

بنورِ تو برافروزم نگہ را — کہ بینم اندرونِ مہر و مہ را
چو می گویم مسلمانم بلرزم — کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

بگوئے تو گداز یک نفس بس
مرا ایں ابتدا ایں انتہا بس
خراب جرأتِ آں رندِ پاکم
خدا را گفت ما را مصطفیٰؐ بس

کہتے ہیں میں نے تو وہ ہائے و ہوئے عشق سیکھ لی ہے جو پتھر سے چشمہ جاری کرتی ہے (سنگِ دل بھی میرے کلام کی تاثیر سے پگھل جاتے ہیں۔ مگر ایک آرزو رکھتا ہوں۔ وہ یہ کہ جاوید کو بھی حضورؐ کے عشق سے رنگ و بو حاصل ہو ۔

ز شوق آموختم آں ہائے و ہوئے — کہ از سنگے کشاید آبجوئے
ہمیں یک آرزو دارم کہ جاوید — ز عشقِ تو بگیرد رنگ و بوئے

کہتے ہیں یہ جہان عشقِ الٰہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اور اسی کے لئے قائم ہے۔ اور عشق کا ظہور محمدؐ رسول اللہؐ کے سینے سے ہوا ہے۔ یعنی جہان میں جو کچھ عشقِ الٰہی ہے یہ حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے عشق کا اثر ہے۔

آپؐ نے عشق کر کے دکھلایا اور دنیا نے آپؐ سے عشق کرنا سیکھا۔ اور آج بھی جہاں کہیں سرِ درِ عشق باقی ہے یہ آپؐ کا صدقہ ہے۔ رہا جبریل کا وجود سو وہ بھی آپؐ ہی کے آئینہ کا جوہر ہے۔

جوہر آئینے سے قائم ہوتا ہے۔ آئینہ جوہر سے قائم نہیں ہوتا۔ نیز جوہر آئینے سے الگ کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح حضورؐ سرورِ کائنات نہ ہوتے تو جبرئیل کس کے پاس آتے۔ بعض فلاسفہ نے یہ بھی کہا ہے کہ جبرئیل علیحدہ کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ ملکاتِ نبوت میں سے ایک ملکہ یا قوائے ملکوتی میں سے ایک قوت ہے جو اللہ نے پیغمبر میں ودیعت کی ہے۔ پھر یوں بھی جبریل ایک قاصد ہیں قاصد کو پیغام کی حقیقت کیا معلوم! اور جب پیغام کی حقیقت ہی معلوم نہیں تو عمل کر کے دکھلانا کیا معنی! ؎

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تُست   سُرورش از مئے دیرینۂ تُست
جز ایں چیزے نمی دانم ز جبریل   کہ او یک جوہر از آئینۂ تُست

مرا ایں سوز از فیضِ دمِ تُست   بتاکم موجِ مے از زمزمِ تُست
خجل ملکِ جم از درویشیِ من   کہ دل در سینۂ من محرمِ تُست

عرض کرتے ہیں، میری مُشتِ غبار سے وہ لالہ اُگا ہے۔ جس کا خون میرے پہلو سے ٹپک رہا ہے آپ ازراہِ دلنوازی اس کو قبول فرما لیجئے کہ میں دل کے سوا اور کوئی چیز نذر کرنے کے قابل نہیں رکھتا۔ (لالہ: جو محبتِ رسولؐ میں خون ہو چکا ہے) ؎

دمید آں لالہ از مشتِ غبارم
کہ خونش می تراود از کنارم

قبولش کن ز راہِ دل نوازی
کہ من غیر از دلے چیزے ندارم

دل ہتھیلی پہ رکھے ہوئے ہوں مگر کوئی دلبر نہیں۔ ایک متاع رکھتا ہوں جس کا غارت گر کوئی نہیں ہے۔ افسوس کہ ایسی متاع کا بھی اس بازار ... نا پرساں میں کوئی خریدار نہیں: لہٰذا ایسا میں ایک ہی شخص ہوں۔ حضورؐ! میری بے کسی و تنہائی پر رحم کیجئے۔ اور میرے سینے میں آباد ہو جائیے۔ ماحصل یہ کہ دل آپؐ کی محبت میں سرشار رہے۔ تو اب آپؐ دُور کیوں ہیں ؎

دلے بر کف نہادم دلبرے نیست — متاعے داشتم، غارت گرے نیست
درونِ سینۂ من منزلے گیر — مسلمانے ز من تنہا ترے نیست

"ملّتِ بیضا کے حضور میں" عرض کرتے ہیں کہ ماہِ نو کی طرح منزل پر پہنچنے کی کوشش کر۔ یعنی ہر قدم آگے بڑھانے اور ترقی کرنے کی سعی کرنی چاہئے۔ اور اگر اس دنیا میں اپنا کوئی مقام مطلوب ہے تو خدا سے دل لگا اور مصطفیٰؐ کے راستے پر چل۔ ترقی و تعالی مسلمان اسی میں ہے کہ وہ حدودِ مصطفیٰؐ سے باہر نہ ہو ؎

بہ منزل کوش مانندِ مہِ نو — دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر — بحق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رو

میں نے تقدیر کے چہرے سے نقاب اُٹھا دیا ہے نا امید نہ ہو اور راہِ مصطفیٰؐ اختیار کر کہ اسی میں کامیابی و کامرانی کا راز مضمر ہے۔ اور اگر میری بات کا یقین نہیں تو تیری مرضی دین سے بھاگ کر کافر کی موت مر ؎

کشودم پردہ را از روئے تقدیر | مشو نومید و راہِ مصطفیٰ گیر
اگر باور نداری آنچہ گفتم | ز دیں بگریز و مرگِ کافرے میر

اقبالؒ کی آخری تصنیف "ارمغانِ حجاز" بھی ختم ہو گئی۔ اب ایک دوسرے طریقے سے اُن کے "عشقِ رسولؐ" کا جائزہ لیتے ہیں۔

عشق و محبت کے الفاظ میں بڑی دلکشی ہے۔ کیسے شیریں اور کیف انگیز الفاظ ہیں اور جب ان کے ساتھ لفظ "رسولؐ" کو اور ملا دیا جائے تو اُن کی جاذبیت اور کیف انگیزی کا کیا ٹھکانہ! یہی وجہ ہے کہ ہر ایک مسلمان اپنے آپ کو عاشقِ رسولؐ کہتا ہے اور فخر کرتا ہے۔ مگر عوام تو عوام کیا خواص میں بھی عشقِ رسولؐ کے تقاضوں کو پورا کرنے والے موجود ہیں؟ جس کو دیکھئے اپنے ذاتی نظریات پر لوٹ ہے۔ یا خود غرض رہنماؤں کے پیچھے چلنے کو دین و ایمان سمجھے ہے۔ مگر جب مرغوباتِ نفس و محبوباتِ طبیعت کے ترک کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو کتنے ہیں جو رسول اللہ کی خوشنودی کے لئے خواہشاتِ نفس کے خلاف جہاد کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں؟ حضورؐ نے جو کتاب ہم کو دی تھی وہ زندہ و پائندہ کتاب ہے۔ غیر فانی، غیر متبدل، ابدی حقائق و زندہ جاوید حکمتوں کا خزانہ۔ جس کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میں تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑ کر جاتا ہوں، قرآنِ کریم اور میری سنّت۔ اگر دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہے تو دین اور دنیا سعادتیں تم پر نچھاور ہوتی رہیں گی کیا اس قرآنِ حکیم کی آیات کو ہم نے اپنی خواہشاتِ نفس کے تقاضوں سے آماجگاہِ تاویلات نہیں بنایا؟ اور یہ کام عوام کا نہیں خواص کا ہے بلکہ ان خواص کا جو متبعین اور عقیدت مندوں کا ایک ایک لشکر اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور جن کی زبان پر ہر وقت قرآنِ کریم کی ہی آیات رہتی ہیں جو تاویلات کے ذریعہ اپنے پیروان سادہ لوح کو

سبز باغ دکھاتے رہتے ہیں۔

ہم ذیل میں اقبالؔ کے ایک خط کا ضروری اقتباس درج کرتے ہیں جو انہوں نے خواجہ حسن نظامی مرحوم کو اُس زمانے میں لکھا تھا جب ان کی کتاب "اسرارِ خودی" کے خلاف طوفانِ بدتمیزی اُٹھا ہوا تھا۔ اس اقتباس سے ایسے قرآن دشمن لوگ بھی سبق حاصل کر سکتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو اقبالؔ کو بے عمل کہتے ہوئے نہیں شرماتے۔ تحریر فرماتے ہیں۔

"میری نسبت آپ کو معلوم ہے کہ میرا فطری اور آبائی میلان تصوّف کی طرف ہے۔ اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ کیونکہ یورپین فلسفہ بحیثیت مجموعی "وحدۃ الوجود" کی طرف رُخ کرتا ہے۔ مگر قرآنِ کریم تدبّر کرنے اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ اور میں نے محض قرآن مجید کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا۔ اس مقصد کے لئے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا"[1]

جو لوگ دین کی مخالفت، قوم میں فساد و انتشار کی تخم ریزی اور اپنے عمل ہی سے نہیں اپنی زبان و قلم سے بھی برملا اسلام کی مذمت اور اس کی تعلیمات کا تمسخر کرتے رہتے ہیں کیا ایسے لوگوں سے ہماری دوستیوں اور رشتہ داریوں میں کبھی فرق آیا؟ ہرگز نہیں۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص ہماری ذات کو برا کہتا ہے۔ ہم پر تنقید کرتا ہے خواہ وہ تنقید

---

[1] مکاتیبِ اقبالؔ۔

صحیح ہو تو کیا، ایسے شخص کے ساتھ بھی ہمارے تعلقاتِ مہر و محبت قائم رہتے ہیں؟ مگر اقبالؒ نے اپنی تمام زندگی میں ذاتی بنا پر کسی کو ایسی بات بھی زبان سے نہیں کہی جو اس کی دل آزاری کا باعث ہو۔ بلکہ جن لوگوں نے ان کی مذمت کی، ان پر اتہام لگائے۔ اور اس طرح اُن کی شدید سے شدید دل آزاری کی، اقبالؒ نے اُن کے لئے بھی کوئی نازیبا کلمہ از زبان نہیں نکالا۔ مگر قوم کی خاطر اور اسلام کے لئے ایک لمحہ بھی کسی غلط بات کو برداشت نہیں کیا۔ اور اس معاملے میں بڑی سے بڑی شخصیت کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے حق بات کہنا اپنا فرض سمجھا۔ حافظ شیرازیؒ کے خیالات کو انہوں نے ملّتِ اسلامیہ کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر نقصان رساں سمجھا تو ان پر بے لاگ تبصرہ کیا۔

جب مولنا حسین احمد مدنی مرحوم نے یہ فرمانا شروع کیا کہ "موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت بنالیں" تو اس پر علامہ اقبالؒ کو بڑا افسوس ہوا کہ حسین احمد مدنی جیسے عالمِ دین کا یہ حال ہے تو اس اُمّتِ مسلمہ کا کیا ہونا ہے حالانکہ قومیتِ مسلم کی بنیاد نہ وطن اور نہ زبان ہے نہ رنگ و نسل بلکہ کلمۂ توحید ہے۔ اقبالؒ نے مولنا کی شخصیت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک فارسی قطعہ لکھا، اور چونکہ اتنی بڑی شخصیت نے مسلمانوں کو ایسا غلط مشورہ دیا تھا جس سے مسلمانوں کی تحریکِ قومیت کو بروقت نقصان پہنچے اور مسلمانوں کے لئے ایک مستقل فتنے کے اُٹھ کھڑے ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے قطعہ کا لب و لہجہ نہایت تند و تیز اختیار کیا۔

قطعہ یہ ہے ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ست!
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

اسی طرح اقبالؔ نے بانیٔ تحریکِ احمدیت کے خلاف بھی اسی قدر مدلل اور پُرزور انداز میں لکھا کہ قادیانیت کے ایوانِ الحاد میں زلزلہ آگیا۔ اور نئے تعلیم یافتہ، جو اسلام سے ناواقفیت کی وجہ سے، اور عوام، جو افلاس کے سبب سے، قادیانیوں کے دامِ تزویر میں گرفتار ہو رہے تھے ایک دم ٹھٹک کر رہ گئے۔ اور دام کو دام سمجھ لیا۔ اگرچہ دام ہمرنگِ زمین تھا۔ ہم ذیل میں اقبالؔ کے اُس انگریزی مضمون کے اُردو ترجمے سے چند اقتباسات درج کرتے ہیں جو انہوں نے ماڈرن ریویو کلکتہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کے تین مضمون شائع ہونے کے بعد جواباً لکھا تھا۔

"میں اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ میں نے قادیانیت کے متعلق جو بیان دیا تھا (جس میں ایک مذہبی نظریئے کی محض جدید اصولوں کے مطابق تشریح کی گئی تھی) جس سے ہم اور قادیانی دونوں پریشان ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجوہ کی بنا پر دونوں اپنے دل میں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہندوستانی قوم پرست جن کی سیاسی تصوریت نے احساسِ حقائق کو کچل دیا ہے۔ اس بات کو گوارا نہیں کرتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساسِ خودمختاری پیدا ہو"۔[1]

"یہ بات بھی بدیہی ہے کہ قادیانی بھی مسلمانانِ ہند کی سیاسی بیداری سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کے سیاسی نفوذ کی ترقی

---

[1] مضامینِ اقبالؔ صفحہ ۱۴۶-۴۷

سے اُن کا یہ مقصد یقیناً فوت ہو جائے گا کہ پیغمبر عرب کی اُمت سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی امت تیار کریں۔ حیرت کی بات ہے کہ میری یہ کوشش کہ مسلمانانِ ہند کو اس امر سے متنبہ کروں کہ ہندوستان کی تاریخ میں جس دور سے وہ گذر رہے ہیں اس میں ان کا اندرُونی استحکام کس قدر ضروری ہے۔ اور ان انتشار انگیز قوتوں سے محترز رہنا کس قدر ناگزیر ہے جو اسلامی تحریکات کے بھیس میں پیش ہوتی ہیں، اور یہ موقع دیتی ہیں کہ ایسی تحریکوں (احمدیت) سے ہمدردی کریں۔"

"یہ سوال کہ الحاد کبیرہ کس کو کہتے ہیں، اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ کسی مفکر یا مصلح کی تعلیم مذہب اسلام کی سرحدوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔"

"ختم نبوت کے تصوّر کی تہذیبی قدر و قیمت کی توضیح میں نے کسی اور جگہ کر دی ہے۔ اس کے معنی بالکل سلیس ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جنھوں نے اپنے پیرؤں کو ایسا قانون عطا کر کے جو ضمیر انسانی کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے، آزادی کا راستہ دکھایا ہے۔ کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سرِ نیاز خم نہ کیا جائے۔ دینیاتی نقطۂ نظر سے اس نظریہ کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم، جسے اسلام کہتے ہیں، مکمل اور ابدی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے جس سے انکار کفر کو متلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریکِ احمدیت کا بانی ایسے الہام کا

حامل تھا۔ لہٰذا وہ تمام عالمِ اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔ خود بانئے احمدیت کا استدلال، جو قرونِ وسطیٰ کے متکلّمین کے لئے زیبا ہو سکتا تھا، یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا نبی نہ پیدا کر سکے تو پیغمبرِ اسلامؐ کی رُوحانیت نامکمّل رہ جائیگی۔ وہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی روحانیت میں پیغمبر خیز قوّت تھی، خود اپنی نبوت کو پیش کرتا ہے لیکن آپ اُس سے پھر دریافت کریں کہ آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ یہ خیال اس بات کے برابر ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی نہیں میں آخری نبی ہوں"

"غرضکہ جب میں بانی احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ اس کے دعوائے نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیغمبرِ اسلام کی رُوحانیت کی تخلیقی قوّت کو صرف ایک نبی یعنی تحریکِ احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبرِ اسلامؐ کے آخری نبی ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے رُوحانی مُورث کی ختمِ نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے"[1]

"بانی احمدیت کے الہامات کی اگر دقیق النظری سے تحلیل کی جائے تو یہ ایک ایسا مؤثر طریقہ ہو گا جس کے ذریعہ سے ہم اس کی شخصیت اور اندرونی زندگی کا تجزیہ کر سکیں گے۔ اس سلسلہ میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مولوی منظور الٰہی نے بانی احمدیت کے ۔۔۔۔

---

[1] مضامینِ اقبال صفحہ ۵۵ - ۱۵۴

الہامات کا جو مجموعہ شائع کیا ہے اُس میں نفسیاتی تحقیق کے لئے متنوع اور مختلف مواد موجود ہے۔ میری رائے میں یہ کتاب بانیِ احمدیت کی سیرت اور شخصیت کی کنجی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ کسی دن نفسیاتِ جدید کا کوئی متعلم اس کا سنجیدگی سے مطالعہ کرے گا۔ اگر وہ قرآنِ کریم کو اپنا معیار قرار دے (اور چند وجوہ سے اس کو ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ جن کی تشریح یہاں نہیں کی جا سکتی) اور اپنے مطالعہ کو بانیِ احمدیت اور اس کے ہم عصر غیر مسلم صوفیا، جیسے رام کرشنا بنگالی کے تجربوں تک پھیلائے گا۔ تو اس کو اس تجزیہ کی اصل ماہیت کے متعلق بڑی حیرت ہوگی جسکی بنا پر بانی احمدیت نبوّت کا دعوے دار ہے۔" لہ

"پس میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈرامہ میں حصّہ لیا ہے۔ زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹ پتلی بنے ہوئے تھے۔ ایران میں بھی اس قسم کا ایک ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ لیکن اس میں وہ سیاسی اور مذہبی امور پیدا ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے جو احمدیت نے اسلام کے لئے ہندوستان میں پیدا کئے ہیں۔ روس نے بابی مذہب کو روا رکھا ہے اور بابیوں کو اجازت دی کہ اپنا تبلیغی مرکز عشق آباد میں قائم کریں۔ انگلستان نے بھی احمدیوں کے ساتھ رواداری برتی۔ اور ان کو اپنا پہلا تبلیغی مرکز ووکنگ میں قائم کرنے کی اجازت دی۔ ہمارے لئے اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا روس اور انگلستان

لہ مضامینِ اقبال صفحہ ۱۵۸ - ۱۵۷

نے ایسی رواداری کا اظہار شہنشاہی مصلحتوں کی بنا پر کیا یا وسعتِ نظر کی وجہ سے۔ اس قدر تو بالکل واضح ہے مگر اس رواداری نے اسلام کے لئے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے لیکن اسلام کی اُس ہیئتِ ترکیبی کے لحاظ سے جیسا کہ میں نے اس کو سمجھا ہے، مجھے یقین کامل ہے کہ اسلام ان دشواریوں سے جو اس کے لئے پیدا کی گئی ہیں زیادہ پاک صاف ہو کر نکلے گا۔"[1]

بہر حال عشقِ رسولؐ کا راستہ اتنا مختصر اور آسان نہیں ہے جتنا ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ جب کسی کے نام سے محمدؐ سُنا تو سر جھکا دیا۔ یا انگلیاں چوم کر آنکھوں سے لگا لیں۔ یا میلاد کے جلسوں میں زحمتِ شرکت گوارا کرنے کے ساتھ ساتھ ذکرِ ولادت کے وقت تعظیماً کھڑے ہو گئے! عشقِ رسولؐ اپنے ساتھ بہت سے تقاضے رکھتا ہے۔ اور انہیں تقاضوں کے پورا کرنے کا نام عشق ہے۔ اقبالؔ کے متعلق جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے یہ عجیب و غریب باتیں نہیں ہیں۔ ایک عاشقِ رسولؐ کا یہی کام ہونا چاہیئے۔ وہ عاشقِ رسولؐ تھے اور یہ باتیں اُن سے بتقاضائے عشق ظہور میں آتی رہی ہیں۔ ملّت کی خاطر جو انہوں نے ذہنی و فکری جہاد کیا ہے کم نہیں ہے۔ عوام جان و مال ہی کی قربانی کو قربانی سمجھتے ہیں۔ اُن کو کیا معلوم کہ طبیعت، عادت اور خواہشاتِ نفس کی قربانی کس قدر مشکل مگر کتنا بلند مقام رکھتی ہے۔ کسی نے مولانا رومؒ سے ایک ایسے زاہد کی تعریف کی جس نے دنیا اور اس کی لذّتوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ تو مولانا نے فرمایا تھا کہ "کاش کردے ودر گزشتے"، اصل میں مردانِ خدا اور عاشقانِ رسولؐ وہی ہیں جو

---

[1] مضامینِ اقبالؔ صفحہ ۱۶۳ - ۱۶۲

عمر بھر کی عادت کو بھی خدا اور رسولؐ کی خوشنودی کے لئے ترک کر دیتے ہیں۔ ہم صرف دو واقعے نقل کرتے ہیں جن سے قوم کی خاطر ان کی مال و دولت بلکہ اپنے ذاتی مقصد سے بے پروائی اور قوم کی اصلاح کے لئے اپنی دیرینہ روش کو خیرباد کہہ کر وہ روش اختیار کرنا معلوم ہوگا جو حضورِ اکرمؐ کا اتباع ہونے کی وجہ سے، حضور اکرمؐ کی خوشنودی کا باعث ہو سکتی ہے۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ مرحوم نادر شاہ جب لاہور کے راستہ سے افغانستان جا رہے تھے تو اقبالؒ بھی اسٹیشن پر ان سے ملنے گئے۔ اور محض ملنے ہی نہیں گئے بلکہ پانچ ہزار روپے کی پیش کش بھی کرنی چاہی۔ حالانکہ یہ روپیہ انہوں نے اپنے کسی خاص مقصد کے لئے جمع کیا تھا۔ مگر یہ کہتے ہوئے کہ وہ میرا ذاتی اور انفرادی مقصد ہے اور جس کے لئے آپ جا رہے ہیں یہ ملّتِ اسلامیہ کا اجتماعی مقصد ہے۔ اس لئے کہ ملّتِ افاغنہ کی آزادی و ترقّی کے لئے ضروری ہے، پیش کش کے قبول کرنے پر اصرار کیا۔

دوسرا واقعہ۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ اقبالؒ کا ایک مضمون "جنابِ رسالت مآبؐ کا ایک ادبی تبصرہ" کے عنوان سے ۱۳۴۱ھ میں شائع ہوا تھا۔ جو کسی قدر اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کی عربی شاعری کی نسبت دفعتاً فوقتاً جن ناقدانہ خیال کا اظہار فرمایا ان کی روشنی صفحاتِ تاریخ کے لئے خطِّ پاشاں کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن دو موقعوں پر جو تنقیدات آپؐ نے ارشاد فرمائیں ان سے مسلمانانِ ہند کو آج کل کے زمانے میں بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا

ادب اُن کے قومی انحطاط کے دور کا نتیجہ ہے۔ اور آج کل انہیں ایک نئے ادبی نصب العین کی تلاش ہے۔ شاعری کیسی نہ ہونی چاہیئے اور کیسی ہونی چاہیئے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جسے جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے و جدانی طور پر اس طرح حل کیا ہے:۔

"اِمرؤ القیس نے اسلام سے (۴۰) سال پہلے کا زمانہ پایا ہے۔ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نسبت ایک موقع پر حسبِ ذیل رائے ظاہر فرمائی تھی۔

"اَشْعَرُ الشعراءِ وَقائدھم الی النار" یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے لیکن جہنم کے مرحلے میں اُن کا سپہ سالار بھی ہے"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امراء القیس کی شاعری میں وہ کونسی باتیں ہیں جنہوں نے حضور سرورِ کائنات سے یہ رائے ظاہر کرائی۔ امرءالقیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شرابِ ارغوانی کے دَورِ عشق و حسن کی بیہوش رُبا داستانوں اور جاں گداز جذبوں، آندھیوں سے اُڑی ہوئی پُرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں، سنسان ریتیلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اور یہی عرب کے دورِ ... جاہلیت کی کل کائنات ہے۔ امرءالقیس قوتِ ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیّل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے۔ اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنونِ لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن یہ کچھ ضروری نہیں کہ دونوں ایک ہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر

بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی اچھا شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیین کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافلین کا تماشا دکھلا دے۔ شاعری دراصل ساحری ہے اور اس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کی مشکلات و امتحانات میں دلفریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے فرسودگی و انحطاط کو صحت و قوت کی تصویر بنا کر دکھلائے اور اس طرح اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ اس کا تو فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصہ اُسے دکھایا گیا ہے اُس میں دوسروں کو بھی شریک کرے نہ یہ کہ اُٹھائی گیرہ بن کر جو رہی سہی پونجی ان کے پاس ہے اس کو بھی ہتھیا لے۔"

"ایک دفعہ قبیلۂ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سُنایا گیا۔

وَلَقَدْ اَبِیْتُ عَلَی الطَّوٰی وَاَظَلُّہٗ حَتّٰی اَنَالَ بِہٖ کَرِیْمَ الْمَاْکَلِ

(ترجمہ) "میں نے بہت سی راتیں محنت اور مشقت میں بسر کی ہیں تا کہ اکلِ حلال کے قابل ہو سکوں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جن کی بعثت کا مقصد وحید یہ تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائیں۔ اور اس کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آئندہ اور مطبوع کر کے دکھائیں، اس شعر کو سن کر بے انتہا محظوظ ہوئے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا "کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوقِ ملاقات نہیں پیدا کیا۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے"۔

"اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزندِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جس کے چہرۂ مبارک پر ایک نظر ڈال لینا نظارگیوں کے لئے دنیوی برکت اور اُخروی نجات کی دوگونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا، خود ایک بُت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے کہ عرب نے اپنے شعر میں اس کی گوں گی بات

رکھی تھی :۔

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عزّت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر ہے طلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں، جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں ان کا نقش پردۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ حضورؐ خواجۂ دو جہاں (ربانی اُمّت و اُمّی) نے جس قدر اس شعر کی تعریف فرمائی ہے اس سے صنعت کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیاتِ انسانی کے تابع ہے، اس پر فوقیت نہیں رکھتی۔" [1]

یہ ۱۳۴۱ھ کا مضمون ہے اور دنیا جانتی ہے کہ اس زمانے سے پہلے خود اقبالؔ کی شاعری کا انداز کیا تھا؟ غزل گوئی سے شاعری کا آغاز ہوا، ارشد گورگانی اور مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لی، اور داغؔ کے طرز میں غزلیں کہیں غالبؔ کا تتبع کیا تو ان کے انداز میں لکھا۔ اس کے بعد مناظرِ قدرت کی عکاسی اور ہندوستانی وطنیت اور ہندی قومیت پر معرکہ آرا نظمیں لکھیں۔ اور یہی موضوعات ایک مدت تک اُن کی جولانگاہِ فکر رہے۔ چنانچہ بانگِ درا، جو اُن کی سب سے زیادہ ضخیم کتاب ہے، اور اُن کے ابتدائی دور کی یادگار ہے، تقریباً اسی قسم کے خیالات کا مجموعہ ہے، لیکن جیسا کہ شروع میں عرض کیا جاچکا ہے، جب انہوں نے قرآنِ کریم کا بغور مطالعہ کیا اور حضورِ اکرمؐ کو پہچانا تو حضورؐ کے عشق میں وہ تمام موضوعات یک قلم ترک کر دیئے اور پھر اپنی شاعری کو اسی معیار پر پورا اتارنے کی کوشش کی جو مضمونِ بالا کے ذریعہ قائم کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حافظ شیرازی کے خیالات پر سخت تنقید کی اور جب لوگوں کے اصرار پر اُن اشعار کو دوسرے

---

[1] رسالہ ترقی (دکن)، بابت ماہ ربیع الاوّل ۱۳۴۱ھ صفحہ ۲۰۲

ایڈیشن سے خارج کیا تب بھی ان کی بجائے جو بات شامل کتاب کیا اس میں بھی ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جو اپنے مضمون میں بیان کیے تھے۔ غرض کہ اپنی شاعری کا رُخ بدل لیتے اور اس کو حضورؐ کے ادبی تبصرے کے مطابق حیات آفریں بنانے میں ان کو اپنی طبیعت کے خلاف معمولی جہاد کرنا پڑا ہوگا۔ مگر محبت میں آدمی سب کچھ کرتا ہے اور برضا و رغبت کرتا ہے ؏

عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را

ہم نے دیکھا ہے کہ شاعری کی جو زمین کسی کے پیروں کو لگ جاتی ہے وہ پھر عمر بھر اُس سے باہر قدم نہیں رکھتا۔ الا ما شاء اللہ۔ مگر اقبالؔ نے عشقِ رسولؐ کی بدولت ان تمام درینہ طریقوں کو ترک کر کے عمر بھر اسلام ہی کی ترجمانی کی۔ جیسا کہ "التماس بحضور رحمۃ اللعالمین" میں عرض کیا ہے ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
در بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

اے فروغت صبحِ اعصار و دہور
چشمِ تو بینندۂ ما فی الصدور

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

تنگ کن رختِ حیات اندر برم
اہلِ ملت را نگہدار از شرم

سبز کشتِ نابسامانم مکن
بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن

خشک گرداں بادہ در انگورِ من
زہر ریز اندر مئے کافورِ من

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

ور دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام
با مسلماناں اگر حق گفتہ ام

ایکہ از احسانِ تو ناکس کس است
یک دعایت مزدِ گفتارم بس است

عرض کن پیشِ خدائے عزوجل
عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل

دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ
بہرۂ از علمِ دیں بخشیدۂ

در عمل پایندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

جس کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے، ناممکن ہے کہ قوم سے محبت نہ ہو اس لئے کہ حضورؐ کو قوم بہت زیادہ عزیز تھی۔ آج جو ہم اپنے نفس کی ادنیٰ خواہش پر قوم کے بڑے سے بڑے مقصد کو قربان کر دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں تو کیا اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ ہمارے دل حضورؐ کی محبت سے خالی ہو گئے ہیں؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمارا ہر کام قوم کی فلاح و بہبود کے لئے ہوتا نہ کہ اپنے نفس کے لئے۔ اقبالؔ نے صاف کہہ دیا ہے کہ ان کو قوم سے اس لئے محبت ہے کہ وہ ان کے محبوب (سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبوب ہے۔ قوم سے خطاب کرتے ہیں کہ ؎

زانکہ تو محبوبِ یارِ ماستی
ہمچو دل اندر کنارِ ماستی

اقبالؔ اور دوسرے نعت گو شاعر

اقبالؔ سے پہلے شعراء نے حضورِ سرورِ کائناتؐ کی تعریف کا وہ انداز اختیار کیا ہے جو دنیاوی حسینوں کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً حضورؐ کا سراپا لکھنے میں زورِ قلم و پروازِ فکر کے کمالات دکھاتے تھے یا غزل کے رنگ میں حضورؐ کے حسن و جمال کی تعریف کرتے تھے۔ اور اسی نہج پر وصال و فراق کی وارداتیں لکھتے تھے۔ اور جن شعراء نے ایسا نہیں کیا انہوں نے بھی جو تعریف و ثنا کی ہے وہ نہایت محدود اور نا تمام پیرائے میں کی ہے۔ مثلاً معراج کے بیان پر اپنی فکری صلاحیتوں اور زورِ طبع کو صرف کیا ہے۔ حضورؐ کے محامد و فضائل میں سے شفیع المذنبین ہونے کی صفت کو زیادہ سے زیادہ سراہا ہے یا معجزات کو شرح و بسط کے

ساتھ بیان کیا ہے اور اس میں اپنی طرف سے لطیف موشگافیاں کی ہیں ۔
حضورؐ کی جناب میں التماس و عرض حال ہے تو اپنی ہی سیہ کاری کا۔ اور حضورؐ
سے شفاعت کی درخواست کی ہے تو اپنے ہی لئے۔ دُکھ درد کا رونا رویا ہے اور
اپنا درماں طلب کیا ہے تو اپنے لئے۔ لیکن حضورؐ نے اس گناہوں سے معمور
دنیا کو کیا سے کیا کر دیا تھا، اس معاشرے کو جو دنیا جہان کی گندگیوں
سے اٹا ہوا تھا کیسا پاکیزہ اور کتنا ارفع و اعلیٰ بنا دیا تھا۔ اس تاریک
ماحول کو جس میں انسان کو خواہ اور سب کچھ نظر آتا ہو مگر اپنا مقام مطلق
نظر نہ آتا تھا۔ اپنے انوار کی ضیا پاشیوں سے کیسا روشن و تابناک
بنا دیا تھا کہ انسان نے سب سے پہلے اپنے آپ ہی کو دیکھا اور ایسا
دیکھا کہ اپنے حُسن و جمال کا عاشق ہو گیا۔ پھر یہ کہ دنیا کی کس طرح
رہنمائی کی، زندگی کے کس شعبے میں کیا اصلاحات کیں وغیرہ ۔
ان باتوں کا جامع و مانع بیان ایک طرف اجمالی تذکرہ بھی کسی نے
نہیں کیا۔ حضورؐ کے اصحاب کی اطاعت خدا اور رسولؐ اور سرفروشی
اسلام کا بیان کسی نے بھی نہیں کیا۔ اور اسی طرح کسی نے اپنے ساتھ ساتھ قوم
کی طرف التفات فرمانے کی درخواست بھی نہیں کی۔ اس میں شک نہیں
کہ بعض اشعار تلاش کرنے سے ایسے بھی نکل آتے ہیں۔ جن میں اس مذکورہ
صدر محدود طریقے سے ہٹ کر بھی کچھ کہا گیا ہے۔ تو وہ اوّل تو الشاذّ
کالمعدوم کے حکم میں آتے ہیں دوم ان میں بھی یہ تفصیل و توضیح اور یہ
دلنشینی کہاں ہے جو اقبالؔ کے اشعار میں پائی جاتی ہے اور پھر بھی ایک چیز
سرے ہی سے مفقود ہے۔ یعنی تصوّرِ "ملّت" کسی کے ہاں بھی نہیں ملتا۔
بہرحال ہم دوسرے شعرا کے ایسے اشعار تلاش کر کے پیش کرتے ہیں تاکہ
ناظرینِ کرام خود اندازہ کر سکیں کہ اقبالؔ نے جو حضورؐ کے اوصاف بیان
کئے ہیں اور ان شعرا کے بیان میں کتنا فرق ہے ۔

حکیم سنائیؒ

آمد اندر جہانِ جاں ہر کس | جانِ جانہا محمدؐ آمد و بس

دُنیا میں آنے کو سبھی آتے ہیں۔ مگر جہان کی جان بن کر محمدؐ ہی آئے ہیں۔ یعنی عالم بشریت، جس پر اخلاقی و رُوحانی موت طاری ہو چکی تھی، آپ کے دم سے زندہ ہو گیا۔

عالم جزو را نظام بدو
غرض نفس کل تمام بدو

نفسِ کُل (خدا تعالےٰ) کے مقصد کی آپ نے تکمیل کی۔ یعنی اس عالم جزویات (دنیا) کا اپنی شریعت کے ذریعہ ایسا انتظام کیا کہ چشم فلک ایسا عالم اب نہیں دیکھ سکے گی۔

آمد از رب سوئے زمینِ عرب
چشمۂ زندگانی اندر لب

آپ دنیا میں اس شان سے تشریف فرما ہوئے کہ دم توڑتی ہوئی انسانیت آپ کے نطقِ جاں بخش کے ذریعہ حیاتِ تازہ سے بہرہ اندوز ہو گئی۔

تیغ و قرآں در اشدہ معجز
نشود شرع او خلق ہرگز

آپ کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن لے کر آئے۔ کہ قرآنِ کریم کی تعلیم سے انسان کی اصلاحِ اخلاق کریں۔ اور اگر کوئی طاقت اس کام سے آپ کو باز رکھنے کے لئے تلوار سے کام لے تو تلوار کا جواب تلوار ہی سے دیا جائے۔

زحمتِ آب و گلِ دریں عالم
رحمتش نام کردہ فضلِ قدم

ترکِ دنیا جو آب و گلِ کے تقاضوں سے بیزار ہو کر کی جاتی تھی۔ اور اس کو نجاتِ اُخروی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا آپ نے ان ہی تقاضوں اور اُن کی تکمیل میں جو زحمت اُٹھانی پڑتی ہے اس کو فضلِ خدا سے تعبیر فرمایا۔ اور یہ دنیا پر آپ کی بہت بڑی رحمت ہے مگر ان تقاضوں کو اللہ کے حکم کے مطابق پورا کرنے کی تعلیم دی ہے ورنہ زحمت کی بجائے رحمت نہیں بن سکتے۔

اے سنائی گر ہمیں جوئی ز لطفِ حق سنا | عقل را قرباں کن اندر بارگاہِ مصطفیٰ
ہیچ مندیش از چنیں عیار ابر ابلیس بود | عاقلہ عقلِ ترا ایمان و سنّت خوں بہا
مصطفیٰ اندر جہاں آنگہ کسے گوید کہ عقل | آفتاب اندر فلک آنگہ کسے جوید سہا

حضورؐ کے ہوتے ہوئے عقلِ ظاہر کی پیروی کرنا ایسا ہی حماقت کا کام ہے جیسے کوئی آفتاب کی موجودگی میں سُہا رجو ایک چھوٹا ستارہ ہے) کا طلب گار ہو۔

رحمۃ للعالمین آمد طبیبت زو طلب
چہ از یں عاصی وزاں عاصی ہمی جوئی شفا

تمہارے طبیب رحمۃ للعالمین ہیں۔ شفا اُن سے طلب کرو۔ دنیا کے فلاسفہ و حکماء جو خود مریض ہیں۔ (مریضِ عصیاں) وہ تمہیں کیا شفا بخش سکتے ہیں۔ ان کی تعلیمات سے تو تمہاری بیماریِ ظن و تخمین میں اور اضافہ ہو گا۔

کاں نجات و آں شفا کار باب سُنّت جستہ اند | بوعلی سینا اندر در نجات، و در شفا
ناشتا نزدیک او خوز آنکہ خود نبود طبیب | مغنی ذوقی دو لیل نبض جز در ناشتا

اپنے طبیب (حضورِ اکرمؐ) کے پاس جاؤ تو نہار مُنہ جاؤ اس لئے کہ نبضِ مریض

کی شناخت ہمارے منہ ہی ہوا کرتی ہے۔ یعنی آپ کی تعلیمات کا مطالعہ کرو تو خلوصِ دل کے ساتھ کرو۔ حکمت و فلسفہ کی عینک اپنی آنکھوں پر لگا کر آپ کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے سے کوئی فائدہ مرتب نہ ہو گا۔ اس لئے کہ آنکھوں پر جس رنگ کی عینک لگاؤ گے ہر چیز اسی رنگ میں نظر آئے گی۔

شیخ فریدالدین عطارؒ:۔

خواجۂ دنیا و دیں گنجِ وفا — صدر و بدرِ ہر دو عالم مصطفےٰ
آنکہ بینش را جز او مقصود نیست — پاک دامن تر از و موجود نیست
گشت او مبعوث تا روزِ شمار — از برائے کل خلق و روزگار
ختم کردہ حق نبوت را بدو — معجزہ و خلق و فتوت را بدو
دعوتش فرمودہ بہر خاص و عام — نعمتِ خود را بدو کردہ تمام
چوں زبانِ حق زبان اوست بس — بہتریں عہدے زبانِ اوست بس
وصفِ او کے لائق ایں ناکس است — واصفِ او خالقِ عالم بس است

یا رسول اللہ بسے درماندہ ام — باد در کف خاک بر سر ماندہ ام
وارد سے دردِ دلِ من مہرِ تست — نورِ جانم آفتابِ چہرِ تست
زیں ہمہ پندارِ و شک تربات — پاک گردانی مرا اے پاک ذات

مولانا رومؒ:۔

یا رسول اللہ حبیبِ خالقِ یکتا توئی — برگزیدہ ذوالجلال پاک بے ہمتا توئی
نازنینِ حضرتِ حق، صدرِ بزمِ کائنات — نورِ چشم انبیاء، چشم و چراغِ ما توئی

یا رسول اللہ تو دانی امت عاجز اند　　عاجزاں را رہنما و پیشوا اے توئی

زاں محمدؐ شافع ہر داغ بود　　گر زشمہ چشم او مازاغ بود
از الم نشرح دو چشمش سرمہ یافت　　دید آنچہ جبرئیل آں برنتافت
گر بگویم تا قیامت نعمت او　　ہیچ او را مقطع و غایت مجو

"مثنوی میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ابو جہل نے آنحضرتؐ کو دیکھ کر کہا (نعوذ باللہ) بنی ہاشم میں ایسا بد صورت شخص پیدا نہیں ہوا۔ فرمایا تو سچ کہتا ہے۔ اتنے میں حضرت صدیق اکبرؓ آئے اور عرض کیا کہ اے آفتابؐ! دو عالم تیرے نور سے منور ہیں۔ ارشاد ہوا تم ٹھیک کہتے ہو۔ حاضرین نے اس کی وجہ پوچھی تو :۔

گفت من آئینہ ام مصقولِ دوست
ترک و ہندو در من آں بیند کہ اوست

"یعنی میں خدا کا صیقل کیا ہوا آئینہ ہوں۔ جس میں ہر کوئی اپنی صورت دیکھتا ہے۔"[1]

مولانا نظامی گنجویؒ :۔

راہ روانِ عربی را تو ماہ
یاد گیانِ عجمی را تو شاہ

---

[1] فاران سیرت نمبر صفحہ ۲۹۱

عالم تر دامن خشک از تو یافت
نافِ زمیں نافۂ مشک از تو یافت

دنیا کا دامن معصیت آپ ہی کے ابرِ کرم سے پاک ہوا۔ اور ملکِ جو نافِ زمین ہے، آپ ہی کی بدولت طہارت و پاکیزگی سے مالا مال ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کی خوشبو نے ایک عالم کے مشامِ جاں کو معطر کر دیا۔

از اثرِ خاکِ تو مشکیں غبار
پیکرِ آں قوم شدہ مشک بار

یہی نہیں کہ آپؐ کی تعلیم سے ان کے اخلاق پاکیزہ ہو گئے بلکہ ان کے اخلاق کی خوشبو نے دوسروں کو بھی متأثر کر دیا۔ دوسروں کے اخلاق بھی درست ہو گئے۔

خاکِ ذلیلاں شدہ گلشن بتو
چشمِ عزیزاں شدہ روشن بتو

عقلِ شفا جوئے و طبیبش توئی
ماہِ سفر سازِ و غریبش توئی

اے مدنی برقع و مکی نقاب
سایہ نشیں چند بود آفتاب

منتظراں را بلب آمد نفس
اے ز تو فریاد بفریاد رس

خاکِ تو لوئے بو لایت سپرد
بادِ نفاق آمد و آں لوئے برد

بارکش ایں مسند ز آسود گاں
غسل دہ ایں منبر از آلودگاں

خانہ غولند بپرداز شاں
در خلہ دان عدم انداز شاں

ما ہمہ جسمیم بیا جانِ تو باش
ما ہمہ دیویم سلیماں تو باش

از طرفے رخنۂ دیں می کنند
وز دگر اطراف کمیں می کنند

یا علیؓ در صف میداں فرست
یا عمرؓ بر سرِ شیطاں فرست

رافت ایں خانہ آفت پذیر! دست برآور ہمہ را دست گیر!
ہر چہ رضائے تو بہ جز راست نیست یا تو کسے را سر و اخواست نیست
گر نظر از راہِ عنایت کنی جملہ مہمات کفایت کنی

جس بات میں آپ کی خوشنودی شامل ہو وہی دُرست ہے ۔ اس لئے جو آپ کے ساتھ ہے اس کو مواخذۂ روزِ حشر کا کوئی اندیشہ نہیں ۔

یتیماں را نوازش در نسیمش ازینجا نام شد دُرِّ یتیمش
بمعنی کیمیائے خاکِ آدم بصورت توتیائے چشمِ عالم
اساسِ حدّ او ختمِ جہاں است شریعتہا باو منسوخ ازاں است

آپؐ خاتم النبیین ہیں ۔ اب قیامت تک کوئی اور نبی نہ ہو گا ۔ دین مکمّل ہو گیا ۔ اور تمام نعمتیں آپؐ پر ختم ہو گئیں ۔ اس لئے ماسبق تمام ... شریعتیں منسوخ ہو گئیں ۔ تمام انبیائے سابقین اسلام ہی کی تعلیم دیتے آئے تھے ۔ مگر محدود جگہ محدود وقت اور خاص خاص قوموں کے لئے آئے اور حضورؐ ساری دنیا کے لئے مبعوث ہوئے ۔ آپؐ کی تعلیم ہر قوم، ہر جگہ اور قیامت تک ہر زمانہ کے لئے ہے ۔ اور مکمّل ہے اس لئے پہلی شریعتوں کی اب ضرورت نہ رہی ۔ جس طرح آفتاب کے نکل آنے پر ستاروں کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔

چراغے کہ پرداز بینش بدوست فروغِ ہمہ آفرینش بدوست
چراغے کہ تا او نیفروخت نور ز چشمِ جہاں روشنی بود دور
سیاہی دہِ خالِ عباسیاں سپیدی دہِ چشمِ شماسیاں
محیطے چہ گویم، چو بارندہ میغ بیکدست گوہر بیکدست تیغ
بہ گوہر جہاں را بیاراستہ بہ تیغ، از جہاں دادِ دیں خواستہ

حضورؐ کی ذاتِ گرامی ایسا چراغ ہے کہ بینائی کی جِلا بلکہ تمام عالم کی روشنی اس کی وجہ سے ہے۔ جب تک یہ چراغ روشن نہیں ہوا تھا، دنیا کی آنکھیں روشنی سے محروم تھیں۔ عباسیوں کے خال کی سیاہی (خوبصورتی) اور شماسیوں کی آنکھ کا نور اسی کی بدولت تھا۔ اس کو سمندر کس طرح کہوں کہ وہ ایسا برسنے والا بادل ہے۔ جس کے ایک ہاتھ میں موتی اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہے۔ موتی (تعلیمِ شریعت) سے جہاں کو آراستہ کیا۔ اور تلوار کے ذریعہ دُنیا سے دادِ دیں حاصل کی۔ دنیا بھر کو دین کا مدّاح بنا دیا۔

خاقانی شروانی:۔

در دار الملک سرِّ قرآں	خطبہ ابدی بنام اوداں
ایزد کہ قسم بہ جانش خوردہ	سجّادہ اش ادیم خاک کردہ
خیمہ زدہ شرع در جنابش	جبل اللہ المتین طنابش

دنیا کہ دو روزہ کاخ دکوخ است
در راہِ محمدی کلوخ است

قرآن مجید کا آخری پیغام ہے۔ اور ابدی ہے۔ اسی قرآنِ مجید نے آپؐ کو آخری نبی کہا ہے یعنی اب قیامت تک کوئی نبی نہ ہوگا۔

اللہ نے، جو قرآنِ کریم میں آپؐ کی جان کی قسم کھاتا ہے وہی آپؐ کے لئے روئے زمین کو مسجد قرار دیتا ہے یعنی مسلمان ہر جگہ نماز پڑھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ جگہ پاک ہو۔

آپؐ کی شرع کی مثال ایک خیمہ کی سی ہے۔ مگر ایسا خیمہ کہ خدا کی رسی (شریعت، جس کی طناب ہے۔

....

یہ دُنیا جو دو روزہ ہے۔ راہِ محمدیؐ میں سنگ کا کام کرتی ہے۔ یعنی جو شخص دنیا کا دلدادہ ہو گیا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ سے دُور ہو گیا۔ دُنیا میں رہنا اور ہے اور دنیا کا ہو لینا اور۔ دنیا کا ہو لینا مذموم ہے۔

بر آستانِ کعبہ مصفّا کنم ضمیر
زو نعمتِ مصطفٰےؐ مزہ کا برآورم

آستانِ کعبہ پر رُو دُ کر صفائے دل حاصل کروں گا اور پھر پاک ومطہر نبیؐ کی تعریف کرونگا۔

دیباچۂ سراچۂ کُل، سرورِ رُسلؐ
کز خدمتش مرادِ مہنا برآورم

تمام موجودات کے لئے حضورؐ کی ذات دیباچہ کا حکم رکھتی ہے (اوّل ماخلق اللہ نوری کے اعتبار سے) اور آپؐ تمام رسولوں کے سردار ہیں۔ میں آپؐ کی خدمت (نعت لکھنے) سے اپنی محبوب مرادیں حاصل کروں گا۔

کے باشد آں زماں کہ رسم باز حضرتش
فریاد یا مغیث اغثنا برآورم

وہ وقت کب دیکھنا نصیب ہو گا کہ جب آپؐ کے آستانے پر باریاب ہو کر "یا مغیث اغثنا" کا نعرہ لگاؤں گا۔ کہ اے فریاد رس میری فریاد سُنئے۔

ازمصارفِ بولہب فعلاں نہ پیچانم عناں
چوں رکابِ مصطفٰےؐ شد مقصد وماوائے من

جب کہ میں نے رکابِ مصطفٰےؐ تھام لی ہے تو اب ان بولہب کردار دشمنوں

سے منہ نہیں پھیر سکتا۔ یہ مجھے کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا سکتے ۔

قاسم رحمت ابوالقاسم رسول اللہؐ کہ ہست
در ولائے او خدیو عقل وجاں مولائے من

وہ قاسم رحمت ہیں اور اللہ کے رسولؐ ۔ ان کی محبت کی وجہ سے عقل و جان کہ جو اپنے اپنے ملک میں بادشاہ ہیں ۔ میرے غلام ہو گئے ہیں ۔ عقل بھی میرے تابع ہے اور دل بھی ۔ اور محبتِ رسولؐ کا ثبوت یہی ہے کہ انسان تابع عقل ونفس ہو جانے کی بجائے عقل ونفس کو حضورؐ کی مرضی کے تابع کر دے ۔

در ملکِ تو عقل پیرِ تدبیر — در بزمِ تو روح چاشنی گیر
تا کوسِ تو صورِ پنج گاہ است — بر چرخ صدائے لا الٰہ است

شیخ سعدی شیرازیؒ :-

بَلَغَ الْعُلیٰ بِکَمَالِہٖ — کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ — صَلُّوْا عَلَیْہِ وَآلِہٖ

چہ غم دیوارِ امت را کہ دارد چوں تو پشتیباں
چہ باک از موجِ بحر آں را کہ باشد نوح کشتیباں

کریم السجایا جمیل الشیم — نبی البرایا شفیع الامم
امامِ رسل پیشوائے سبیل — امینِ خدا مہبطِ جبرائیل
یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست — کتب خانۂ چند ملت بشست
بلا قامتِ لات بشکست خرد — باعزازِ دیں آبِ عزیٰ ببرد

نماند بعصیاں کسے در گرو | کہ دارد چنیں سیدِ پیشرو

حضرت امیر خسروؒ:-

عُروۂ وثقیٰ اکنفِ نورِ او | جبلِ متیں نسخۂ منشورِ او
بارِ جہاں بر دلِ آں نازنیں | سینۂ چناں نازک و بارش چنیں

آپؐ کے نور کا پہلو عُروۂ وثقیٰ ہے اور آپ کا نسخۂ منشور (قرآنِ کریم) جبلِ متین ہے۔ جس نے آپؐ کے نور میں پناہ لی گویا اس کو عُروۂ وثقیٰ مل گیا اور جس نے قرآنِ کریم پر عمل کیا اس نے اللہ کی مضبوط رسی تھام لی۔ آپؐ کے دلِ نازک پر دُنیا بھر کی ہدایت کا بار ہے۔ کس قدر نازک دل کتنا بڑا بار اپنے اوپر لئے ہوئے ہے۔

پردہ کشِ اُمتِ شوریدہ کار | ضامنِ امرزشِ آمرزگار
نامۂ آزادیِ خاص است و عام | کردہ بتوقیعِ رسالت تمام
تیغ کشیدہ قلم انداختہ | فتنہ ز تیغش علم انداختہ

بادِ ہمیشہ رہِ ما سوئے او
سرمۂ ما خاکِ سرِ کوئے او

اے سخنت گنجِ خدا را کلید | گوہرِ آں گنج تو کردی پدید
لعلِ تو گنجینۂ رحماں کشاد | چشمِ تو دروازۂ احساں کشاد
از لبِ تو بے الفی صدر جاست | جاں بتواں کند چو لیسین بجاست
بر توِ تو مشعلِ راہِ ہمہ | ظلِ لوائے تو پناہِ ہمہ

ہر کہ طرازِ تو ببازو نہاد
نقدِ دو عالم بترازو نہاد

مولانا جامیؒ :-

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب — خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب
رفتہ ز دستیم، بروں کن ز برد — دستے و بنمائے یکے دستبرد
برقِ فراقت چو جہاں سوز شد — مشعلِ یارانت شب افروز شد
مشعلِ شاں چرخ چہ بے نور کرد — صبحِ بدی را شبِ دیجور کرد

ظلمتِ بدعت ہمہ عالم گرفت
بلکہ جہاں جامۂ ماتم گرفت

کاش فتد اوجِ عروجت رجوع — باز کند نورِ جمالت طلوع
دیدۂ عالم بتو روشن شود — گلخنِ گیتی بتو گلشن شود

ز بستانِ وفا آزاد سروے — ز باغِ اصطفا رعنا تدروے
اگرچہ کور شد ز دیں چشم ہر خام — چو سرمہ ساخت روشن چشم اسلام
پئے دیوارِ ایماں بود کارش — ولے شد پائدار از چار یارش
کجا در راہِ دیں درد آزمائے — کہ تا یابد بہ ہر دردے دوائے

ز مہجوری برآمد جانِ عالم — ترحم یا نبی اللہ ترحم
نہ آخر رحمۃٌ للعالمینی — ز محروماں چرا غافل نشینی
ز خاک اے لالۂ سیراب برخیز — چو نرگس خواب چند از خواب برخیز
بروں آور سر از بردِ یمانی — کہ روئے تست صبحِ زندگانی
شبِ اندوہِ ما را روز گرداں — ز رویت روزِ ما فیروز گرداں

تو ابرِ رحمتی آں بہ کہ گاہے   کنی بر حالِ لبِ خشکاں نگاہے

زخوانِ عامِ تو ہر کس گرفتہ بہرۂ خاص   بقدرِ مرتبۂ خویشتن اچہ خاص وچہ عام
زفیضِ جامِ تو جامی مدام جرعہ کش است   بلے النصیب بود خاک را زکاسِ کرام

عرفی شیرازی

آرایشِ ایوانِ نبوت کہ زتعظیم
خاکِ درِ او اوجِ شرف داد قسم را

تا نامِ ترا افسرِ فہرست نکردند   شیرازۂ مجموعہ نہ بستند کرم را

سایہ یزدانی والوارِ حمایت دلیل   داورِ کونینی والوارِ احسانت سپاہ
بسکہ دستِ رحمتت آرائشِ ہر چہرہ کرد   عشق می ورزد بجنسِ یاس وامید اشتباہ
از خیالِ ہیبتِ اندیشہ میرد در ضمیر   وز نشانِ آستانت سجدہ رقصد در جباہ

اے مہرِ تو جانِ آفرینش   نعتِ تو زبانِ آفرینش
لطفِ تو چمن طرازِ امکاں   خشمِ تو خزانِ آفرینش
معراجِ تو در ہوائے لاہوت   حدِ طیرانِ آفرینش

شہنشاہے کہ ہست از غایتِ درویشی وہمت
وجودِ خود فراموشِ دعمِ عالم فرادانش

اے کہ وقتِ گذارشِ پیغام | صبحِ نزدِ عشا فرستادی
گمرہاں را بہ ظلمتِ خذلاں | نورِ شمعِ ھدا فرستادی
دو جہاں را ز راہِ حکمت و عدل | تحفہ ہائے عطا فرستادی

فیضی :-

مشعل نہ پیش گاہِ اقرار
آتش زنِ دودمانِ انکار

آپ اقرار کرنے والوں (مومنوں) کے سامنے مشعل ہدایت رکھنے والے ہیں اور انکار کرنے والوں (منکروں) کے خاندان کو ندرِ آتش کرنے والے۔

باشرع و کتاب نورِ ساطع | باتیغ و زباں دلیلِ قاطع

آپؐ کی ذات اپنی شریعت اور کتاب کے ساتھ نورِ ساطع ہے۔ اور تیغ و زبان کے ساتھ دلیل قاطع، کہ کفر و الحاد اور فسق و فجور نہ آپؐ کی زبان کے مقابلے میں ٹھہر سکتا ہے نہ آپؐ کی تلوار کے مقابلے میں۔

خاکی و باوج عرش منزل | اُمّی و کتاب خانہ در دل

جسمانی اعتبار سے آپؐ خاکی ہیں مگر روحانی اعتبار سے آپؐ کا مقام عرش ہے۔ لیکن آپؐ اُمّی ہیں، یعنی کسی کے آگے زانوئے شاگردی تہ نہیں کیا۔ مگر علم و معارف کا کارخانہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔

نطقش کہ مثالِ فَاسْتَقِمْ یافت | طغرائے جوامع الکلم یافت

حضورؐ کے نطقِ مبارک کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فَاسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ

وَمَنْ تَابَ مَعَکَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّہٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ کا حکم خداوندی ملا۔ (اور آپؐ نے اس پر پورا پورا عمل کیا تو اس کا صلہ یہ ملا کہ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن الفاظ کو جو حضورؐ نے (وحی کے علاوہ خود فرمائے) "جَوَامِعُ الْکَلِمِ" ہونے کا طغریٰ مل گیا۔ جَوَامِعُ الْکَلِمِ ایسے جامع کلمات جن میں بطون و معانی جامع ہوں۔ کم الفاظ اور کثیر معانی۔

پوری آیۂ مبارک کا ترجمہ یہ ہے:۔

اے پیغمبرؐ! تم سیدھا راستہ چلو۔ ایسا سیدھا کہ جیسا آپ کو حکم ہوا ہے۔ اور جس نے آپؐ کے ساتھ توبہ کی۔ اور حد سے نہ بڑھو۔ اور اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

صبحش چو دمید عالم افروز
ونیش بصد آفتاب شد روز

آپؐ کی بعثت سے جو عالم افروز تھی۔ آپؐ کا دین ایسا روزِ روشن کی طرح عالم آشکارا ہو گیا کہ گویا سینکڑوں آفتاب سے روشن کیا ہوا دن ہے

بتخانۂ سپردۂ پےِ او | آتشکدہ کشتۂ خوئے او
نورے است زچشم کو تہاں دور | عالم ہمہ سایۂ ازاں نور
رضوانِ خدائے بر صحابہؓ | گنجینہ کشائے نہ خرابہ
برتارکِ عرش پائے فرشش | بر کرسیِ صدق اصل و فرعش

گر ظلمتِ شب خرد کند دور
فرعش بر ہ خرد نہند نور

جب تک کہ عقلِ انسانی ریب و شک کی تاریکی سے باہر نہ نکلے گی آپؐ کی شریعت سے نورِ ہدایت حاصل نہیں کر سکتی۔ (ریب و شک

خود شریعت کے بارے میں)

بر دانشِ ما انجم و افلاک بخندند
گر صاحبِ لولاک لما را نشناسیم
صد شکر کہ ما پیروِ اصحابِ رسولیمؐ
در شرعِ دگر راہ نما را نشناسیم

مولانا غلام امام شہیدؒ:-

آں مرحمتِ حق کہ پئے رحمتِ عالم
قد ارسلہٗ اللّٰہ رؤفاً و رحیما
صیقل گرِ ایام کہ از صفوتِ رائش
ز آئینۂ امروز نماید رخِ فردا

ایں نورِ محمدیؐ ست دریاب
روشن گرِ جانِ آفرینش
نیسانِ کرم، محیطِ احساں
ابرِ فیضانِ آفرینش
آہنگ شناسِ فقرِ فخری
سلطانِ زمانِ آفرینش

اے جوہرِ جانِ آفرینش
سرمایۂ کانِ آفرینش
آں آیۂ رحمتی کہ نازل
گردید بشانِ آفرینش
رفتی و براہِ تست حیراں
چشمِ نگرانِ آفرینش
اے جانِ جہاں رسیدہ برلب
از ہجرِ تو جانِ آفرینش
برخیز کہ فتنہ گشت بیدار
از خوابِ گرانِ آفرینش

اے ابرِ نیسانِ کرم دے بحرِ احسانِ اتم
دستت بداماں ہم لولوئے لالہ ریختہ
فیضِ تو کرد از زائے، با کعبہ آبادانئے
آبادیش ویرانئے بر لانۂ عزیٰ ریختہ
لطفِ تو از آبِ بقا پر کردہ جامِ اتقیا
چشمِ تو طوفانِ بلا بر گبر و ترسا ریختہ

رو دلش زبسکہ آئینۂ حق نما بود　　　وصلِ خدائے پاک وصالِ محمدؐ است

باغِ کونین تازگی دارد　　　از بہارِ تو یا رسولؐ اللہ
مصحف و اہلِ بیت را دانیم　　　یادگارِ تو یا رسولؐ اللہ
زینتِ چار بالشِ دینند　　　چار یارِ تو یا رسولؐ اللہ
شانِ شاہی دہد نشاں بجہاں　　　از شعارِ تو یا رسولؐ اللہ

محسنؔ کاکوروی رح:-

پیشوائے رُسل و سیدِ نسلِ آدم　　　جلوۂ حضرتِ حق، نورِ مجسم ہمہ تن
جس کی توصیف میں خود خامۂ نقاشِ ازل　　　لکھ چکا، مطلعِ ایجاد، بوجہ احسن
جس کی ہے شرع متیں ناسخِ ادیانِ دملل　　　مثبتِ حق و یقیں کاشفِ ہر شبہ وظن

کیسی تصویر جب کھینچ کے نقاشِ ازل　　　خود لگا کہنے کہ ہر وصف میں ہے تو اوّل
تیری صورت سے کھلے معنی ما قلّ و دل　　　انبیا شرحِ مفصّل ہیں تو متنِ مجمل
تو ہے خورشید ترے سامنے انجم ہیں نبی
تو ہے شمسیہ تصور ہیں تو سب ہیں قطبی
بولے جبریل کہ تجھ پر ہوئی ختمِ تکمیل　　　آدمؑ و نوحؑ کے بخشے تجھے اوصافِ جمیل
خضر و الیاسؑ کا رتبہ شرفِ اسمٰعیلؑ　　　اور سوا اس کے بھی اے سرورِ باغِ خلیل
حُسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

سر بہ جاہ بہ فخر اس کو دحیم توکّل ہے — حریمِ ناز میں تکیہ خدا ہے اس کی مسند کا
کھنچی ہے رحمتِ یزداں کی گویا شکلِ مستقبل — تعالی اللہ رنگِ عارض اُس نورِ مجرد کا

فضلیت پہ تری مشتمل آثار و کتب — اوّلیت پہ تری متفقّ ادیان و ملل
لطف سے تیرے ہوئی شوکتِ ایماں محکم — قہر سے سلطنتِ کفر ہوئی مستاصل
جس طرف ہاتھ بڑھیں کفر کے ہٹ جائیں قدم — جس جگہ پاؤں رکھے سجدہ کریں لات و ہبل

لقب امّی دِل لوحِ محفوظ اس کے سینے میں — پھر اعلمِ اوّلین و آخریں پیدا و پنہاں کا
فصاحت ہمہ تن تھی لبِ جاں بخش حضرت کا — زبانِ شستہ گویا نسخہ تھا اعجازِ قرآں کا

قدسی

ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات — رحم فرما کہ ز حد می گذرد تشنہ لبی
بر درِ فیضِ تو استادہ بصد عجز و نیاز — رومی و طوسی و ہندی حلبی و عربی
سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی — آمدہ پیشِ تو قدسی پئے درماں طلبی

یہ قدما سے لے کر متاخرین تک، یعنی اقبالؔ سے پہلے شعراء کے نعتیہ کلام کا نمونہ ہے۔ اقبالؔ کے زمانے اور مابعدِ اقبالؔ شعراء سے ہمارے مضمون کا تعلق نہیں ہے۔ اور یوں بھی بقول ملک الشعراء بہارؔ یہ زمانہ "عہدِ اقبالؔ" ہے۔ یعنی اس زمانہ کا کوئی شاعر اقبالؔ کے اثر سے آزاد نہیں رہ سکا ہے۔

یہ نمونۂ کلام کسی قدر تلاش و جستجو سے اُن شعراء کے کلیات

اور تصانیف کی ورق گردانی سے حاصل ہوا ہے۔ اور نعت کے یہ وہ مضامین ہیں جو اوپر ذکر کئے ہوئے محدود طریقۂ بیان سے کسی قدر ممتاز ہیں۔ ہم کو یہاں مطلق نعتیہ کلام سے بحث نہیں ہے۔ ورنہ اس اعتبار سے ہر دور کے نعت گو شعراء اور عاشقانِ رسولؐ کے کلام میں ایسے اشعار موجود ہیں کہ ان کا جواب نہیں ہو سکتا۔ یعنی حضورؐ کی جناب میں نہایت خلوص و محبت کے ساتھ نذرانۂ عقیدت و نیاز کی پیشکش، حضورؐ کے حسن و جمال کی تعریف، حضورؐ کے معجزات کا بیان، معراجِ نبویؐ، اپنے گنہگار ہونے اور حضورؐ شفاعت سے متعلق مضامین اور حضورؐ کی اس تعریف میں جو بادشاہوں کی تعریف کے انداز میں کی گئی ہے، ایسے بے پناہ، نادر اور لطیف اشعار ملتے ہیں کہ ان کے پڑھنے کے بعد بے ساختہ منہ سے نکل جاتا ہے کہ

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

اور پھر خاقانیؒ، نظامیؒ، سعدیؒ، جامیؒ، خسروؒ، اور غلام امام شہیدؒ کا فارسی میں اور شہیدیؒ، محسن کاکورویؒ اور امیر مینائیؒ مرحوم کا اردو شعراء میں کیا جواب ہو سکتا ہے! جامیؒ کے تو ایک ہی شعر کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے اقبالؔ نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ؎

کشتۂ اندازِ ملا جامی ام — نظم و نثرِ او علاجِ خامی ام
شعر لبریزِ معانی گفتہ است — در ثنائے خواجہ گوہر سفتہ است

"نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
ہر دو عالم بندگانِ خواجہ اوست"

اور ایسے اشعار ایک دو نہیں اس کثرت سے ہیں کہ ان کا استقصار بھی مشکل ہے اور اس کے باوجود بھی یہ حضرات نہایت خلوص کے ساتھ اعترافِ عجز و تقصیر ہی کرتے رہے ہیں ۔ آج تک کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے خواجۂ دوجہاںؐ کی مدح و ثنا کا حق ادا کر دیا ہے ۔ ہم ایسے اشعار میں سے بھی اپنے مذاق کے مطابق بعض منتخب شعر نقل کرتے ہیں ۔۔ تاکہ ناظرینِ کرام اس شرابِ تند و تیز کے بھی دو چار گھونٹ پی لیں ۔

شیخ حکیم سنائیؒ :-

بر نہادہ خدائے در معراج — بر سرِ ذاتش از لعمرک تاج

نعتِ آں روئے والضحیٰ آمد — صفتِ زلف اذا سجیٰ آمد
ہمتش الرفیق الاعلےٰ جوئے — عزتش لا نبی بعدی گوئے

شیخ فرید الدین عطارؒ :-

ہر دو گیتی گردِ خاکِ پائے تست — در گلیمے خفتۂ پہ جائے تست!
بیکساں را کس توئی در ہر نفس — من ندارم در دو عالم جز تو کس
یک نظر سوئے منِ بیچارہ کن — چارۂ کارِ منِ غم خوارہ کن
گرچہ ضائع کردہ ام عمر از گناہ — توبہ کردم عذرِ من از حق بخواہ
اے شفاعت خواہ مشتے تیرہ روز — لطف کن شمعِ شفاعت بر فروز
دیدۂ جاں را بقائے تو بس است — ہر دو عالم را رضائے تو بس است

دار وے دردِ دلِ من مہرِ تست
نورِ جانم آفتابِ چہرِ تست

مولانا نظامی گنجوی رحؒ

احمدِ مرسل کہ خرد خاکِ اوست
ہر دو جہاں بستۂ فتراکِ اوست
اے تنِ تو پاک تر از جانِ پاک
روحِ تو پروردۂ روحی فداک

اے مدنی برقع و مکی نقاب
سایہ نشیں چند بود آفتاب
منتظراں را بلب آمد نفس
اے ز تو فریاد بفریاد رس!

اے نفست نطقِ زباں بستگاں
مرہم سودائے جگر خستگاں

محمد کافرینش ہست خاکش
ہزاراں آفریں بر جانِ پاکش
چراغ افروزِ چشمِ اہلِ بینش
طرازِ کارگاہِ آفرینش

حضرت امیر خسرو دہلوی رحؒ:-

غرۂ ما از خمِ ابروئے تست
طرۂ ما از شکنِ موئے تست
ہر کہ طراز تو بیاز و نہاد
نقدِ دو عالم بتراز و نہاد
منکہ بجاں تشنۂ روئے توام
خسروم اما سگِ کوئے توام

عرفی شیرازیؒ:-

تقدیر بیک ناقہ نشاید دو محمل — سلمائے حدوثِ تو و لیلائے قدم را
تا نام ترا فیصر فہرست نکردند — شیرازۂ مجموعہ نہ بستند کرم را

گر ز تپش جمالِ تو نگیرد — از سینہ بروں کنم صفا را
گنج بکف آورم گر شاید — سرمایۂ نعتِ مصطفیٰؐ را

خاقانی شروانیؒ:-

ایزد کہ قسم بجانش خوردہ است — سجادہ نشین و یم خاک کردہ است
شکر گہ دیں ستانۂ او — کعبہ شدہ کوس خانۂ او

طرفِ کمر تراست جاوید — پیروزۂ چرخ، لعلِ خورشید
تاریخِ شرف کہ آسماں راست — از روزِ ولادتِ تو برخاست

جامیؒ:-

اخترِ برجِ شرفِ کائنات — گوہرِ دُرجِ صدفِ ممکنات
جنبشِ اوّل ز محیطِ قدم — سلسلہ جنبانِ وجود از عدم
صدر نشینِ او ست دریں بارگہ — گشتہ نبیاً بود او را گواہ

بود رُخ شمع نبوت فروز — آب ندیدہ گلِ آدم ہنوز
رفعتِ او منبرِ افلاک را — رونق از خطبۂ لولاک را
جُبّۂ آں شانِ رسالت مآب — چرخ زند خیمۂ زرّیں طناب
خندۂ او جاں بجہاں در دمید — منصبِ احیا بہ مسیحا رسید
نورِ جبیں ناصیۂ پاکِ او — حبلِ متیں حلقۂ فتراکِ او
طرّۂ او نافۂ دولت گشائے
غرّۂ او نورِ سعادت فزائے

اے لبرا پردۂ یثرب بخواب — خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب
رفتہ ز دستیم برون کن ز برد — دستے و بنمائے یکے دستبرد
ظلمتِ بدعت ہمہ عالم گرفت — بلکہ جہاں جامۂ ماتم گرفت
کاش فتد ز اوجِ عروجت رجوع — باز کند نورِ جمالت طلوع
دیدۂ عالم بتو روشن شود — گلخنِ گیتی بتو گلشن شود
جامیؔ ازاں جا کہ ہوادارِ تست
روئے تو نادیدہ گرفتارِ تست

اے عربی نسبت دائی لقب — بندۂ تو ہم عجم و ہم عرب
گرد سرِ ابطحی و یثربی — خاکِ درت مشرقی و مغربی
تیغِ عرب زن کہ فصاحت تراست — صیدِ عجم کن کہ ملاحت تراست
اند تو سینہ راست سپیدیٔ امید — بہ کہ سیاہی نہ نہی بر سپید
طوطیٔ طبعم کہ ثنا خوانِ تست
در ہوسِ یک شکر افشانِ تست

ز مہجوری بر آمد جانِ عالم — ترحم یا نبیؐ اللہ ترحم
ز خاک اے لالۂ سیراب برخیز — چو نرگس خواب چند از خواب برخیز!
بروں آور سر از بُردِ یمانی — کہ روئے تست صبحِ زندگانی
شبِ اندوہ ما را روز گرداں — ز رویت روزِ ما فیروز گرداں
ادیمِ طائفی نعلینِ پا کن — شراک از رشتۂ جانہائے ما کن
جہانے دیدہ کردہ فرشِ راہند — چو فرشِ اقبالِ پا بوسِ تو خواہند
ز حجرہ پائے در صحنِ حرم نہ — بفرقِ خاکِ رہ بوساں قدم نہ
تو ابرِ رحمتی آں بہ کہ گاہے — کنی بر حالِ لب خشکاں نگاہے
بخود درماندہ ایم از نفسِ خود رائے — ببیں درماندۂ چندیں بہ بخشائے
اگر نبود چو لطفِ دستیارے — ز دستِ ما نیاید ہیچ کارے
چو ہولِ روزِ رستا خیز خیزد — ز آتشِ آبروئے ما نریزد

جامی کز تندِ بادِ عصیاں — شد خرمنِ طاعتش بتاراج
اکنوں رہِ معذرت گرفتہ — مسکیں بہ شفاعتِ تو محتاج

جہاں روشن است از جمالِ محمدؐ — دلم زندہ شد از وصالِ محمدؐ
خوشا مسجد و منبر و خانقاہے — کہ در وے بود قیل و قالِ محمدؐ
بود در جہاں ہر کسے را خیالے — مرا از ہمہ خوش خیالِ محمدؐ

بہ صدق و صفا گشت بیچارہ جامی
غلامِ غلامانِ آلِ محمدؐ

معراج:-

شبے دیباچۂ صبحِ سعادت | ز دولت پایۂ روز افزوں زیادت
سوادِ طرۂ اش خجلت دہِ حور | بیاضِ غرۂ اش نورٌ علیٰ نور
نسیمش جعدِ سنبل شانہ کردہ | ہوایش اشکِ شبنم دانہ کردہ
طرب را چوں سحر خنداں ازاں لب | گریزاں روزِ محنت زد شباشب
دریں شب آں چراغِ اہلِ بینش | سرائے آفریں از آفرینش
چو دولت شد ز ہر خواباں نہانی | سوئے دولت سرائے امہانی
دلش بیدار و چشمش در شکر خواب | ندیدہ چشمِ بخت ایں خواب در خواب
درآمد ناگہاں ناموسِ اکبر | سبک رو تر ازیں طاؤسِ اخضر
بروما لید پر کاے خواجہ برخیز | کہ امشب خواب آمد دولت انگیز
بروں بر یک زماں زیں خوابگہ رخت | تو بختِ عالمی بیدار بہ بخت
ازاں دولت سرا چوں خواجۂ دیں | خراماں شد بہ عزمِ خانۂ زیں
شد از سبوحیان گردوں صدادہ | کہ سُبحٰنَ الَّذِیْ اَسْریٰ بِعَبْدِہٖ

مسجدِ اقصیٰ میں تمام انبیائے ماسبق کی امامت کرنے اور آسمانوں سے گزرنے کے بعد لامکاں میں داخل ہوتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں ؎

مکانے یافت خالی از مکاں نیز | کہ تن محرم نبود آنجا و جاں نیز
قدم زنگِ حدوث از جان او شست | وجوب آلائشِ امکان او شست
یکے ماندہ ہم از قیدِ یکی پاک | ز بسیاری بروں و ز اندکی پاک
بدیدہ آنچہ از دیدن بروں بود | مپرس از ما کہ کیفیت کہ چوں بود

فرو بند از یکی لب وز فند و نی — نہ چندی گنبد آنجا و نہ چونی

شنید انگہ کلامے نے بآواز

معانی در معانی راز با راز

جامیؒ :-

یا صاحب الجمال و یا سیّد البشر — من وجہک المنیر لقد نوّر القمر

لا یمکن الثناء کما کان حقّہٗ — بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر

قدسیؒ :-

مرحبا سیّدِ مکّی مدنی العربی — دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر — اے قریشی لقبی ہاشمی و مطلبی

ماہمہ تشنہ لبانیم توئی آبِ حیات — رحم فرما کہ زحد می گزرد تشنہ لبی

شبِ معراج عروجِ تو ز افلاک گزشت — بمقامے کہ رسیدی نرسید ہیچ نبی

ذاتِ پاکِ تو کہ در ملکِ عرب کرد ظہور — زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی

نسبتِ خود بسگت کردم و بس منفعلم — زانکہ نسبت بہ سگے کوئے تو شد بے ادبی

عاصیانیم ز مانیکئ اعمال مپرس — سوئے ما روئے شفاعت بکن از بے سببی

بردرِ فیضِ تو استادہ بصد عجز و نیاز — رومی و طوسی و ہندی و حلبی و عربی

سیّدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی — آمدہ پیشِ تو قدسی پئے درماں طلبی

غنی کاشمیری:-

اے جامۂ فقر زیب پیرایۂ تو	درویش و غنی توانگر از مایۂ تو
از خامۂ صنع سر نزد نقش دو کون	تا حرف نہ شد سیاہی سایۂ تو

ناصر علی سرہندی:-

پیش از ہمہ شاہان غیور آمدۂ	ہر چند کہ آخر بہ ظہور آمدہ
اے ختم رسلؐ! قرب تو معلومم شد	دیر آمدۂ زراہ دور آمدہ

فیضی:-

آں مرکز دور ہفت جدول	گرداب نشین موج اول
چابک قدم بساط اخلاک	والا گہر محیط لولاک!
از رایت کبریا مؤید	سر لشکر انبیا محمدؐ
ہم مطلع اول سباعی	ہم مصرع آخر رباعی
اسرار ازل خزینۂ او	محراب ابد مدینۂ او
زاں خوئے کہ بہ گل فشاند دستش	ہر قطرہ بہار صد گلستاں
صد باغ بہشت شد نسیمش	صد اطلس چرخ در گلیمش
ناموس سحر بہ عنبریں مو	نقاش چمن بہار گیسو
گیسو دو سوئے بر شکستہ	کونین بتار موئے بستہ
صد صبح بہار در جبینش	صد دست چمن در آستینش
یک عقدہ عمامہ بر کشادہ	صد طبلۂ صبح سر کشادہ

از یوسفیش بہشت خرگاہ — صد تیغ و ترنج در کفِ ماہ
نورے است زچشم کوتہاں دور — عالم ہمہ سایہ از اں نور
یک نور دو کون روشنائی — یک گوہر و صد جہاں روائی
رضوانِ خدائے بر صحابہؓ — گنجینہ کتائے نہ خرابہ
مانند بہ پیش گاہِ ایام — بہ دولتِ شِ وفا لوائے اسلام

نظیری نیشاپوری:-

صفا انگر عقدہ دلہاست آں زلفِ معقّد را
بحمد اللہ کہ ربطے ہست با مطلق مقید را
کہ دادے روح را با جسم الفت گر نہ گردیدے
محمدؐ کاروال سالار ارواحِ خرد را
بیک حسن و شمائل طرحِ عشقِ ہستی افگندہ شد ورنہ
نمی دادند نقشِ ہستی ایں لوحِ زبر جد را
حدیث دلفروزش لبکہ شد مجموعۂ حکمت
حکیماں جز و می سازند اوراقِ مجلد را
بمسکن بستر از پہلوئے گرمش سرد ناگشتہ
کند طے بر براقِ معرفت اقتصائے مقصد را
گرامی میہمانے در رہ امشب میزباں دارد
ملائک صف بہ صف پر بستہ عرش آراستہ مسند

غلام امام شہیدؒ:-

شبِ میلادِ سلطان است امشب
زمیں بر خویش نازاں است امشب

ز نورِ مصطفیٰؐ ہر جا کہ بینی
تجلی گاہ یزداں است امشب

سرائے او کہ از نور است معمور
تو گوئی عرش سجاں است امشب

لبِ حوراں ترنم ریز تسبیح
بگرد دل زہرہ رقصاں است امشب

ملائک تہنیت گویاں کر لاریب
شبِ قدرِ عزیزاں است امشب

بہ ہر کوئے کہ می بینم بہ عالم
بہارِ باغِ رضواں است امشب

شہیدِ بینوا اے ہمچو بلبل
دریں گلشن غزل خواں است امشب

امیر مینائی لکھنوی

امّت کو عشق سرورِ عالی صفات کا
طوفانِ حشر میں ہے سفینہ نجات کا

یاد جب مجھ کو مدینہ کی فضا آتی ہے
سانس لیتا ہوں تو جنّت کی ہوا آتی ہے

یہ مُشتِ خاک مدینہ کے گرد پھیر پھر کے
کروں نثار جو قسمت ملے بگولوں کی

زمانے بھر میں ہے اصحابِ پاک کی خوشبو
مہک گیا چمنِ دہر چار پھولوں سے

مدینہ جاؤں پھر آؤں مدینہ پھر جاؤں
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

تولا ہے بہت جانچ کے اربابِ نظر نے
ہیں شمس و قمر سنگِ ترازوئے محمدؐ

خالی ہاتھ آئیگی روضہ پہ نہ حضرت بہار
پھول فردوس کے چن لائے گی مالن بنکر

خدا کریم، محمدؐ شفیعِ روزِ جزا
امیر کیا ہے حقیقت مرے گناہوں کی

محسنؔ کاکوروی :-

مولا کی نوازشِ نہاں کھلتی ہے
عزت مری پیشِ قدسیاں کھلتی ہے
کہہ دو کہ ملک گوش بر آواز رہیں
مداحِ پیمبرؐ کی زباں کھلتی ہے

گلِ خوش رنگ رسولِ مدنی عربی
زیبِ دامانِ ابد طرۂ دستارِ ازل
نہ کوئی اُس کا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر
نہ کوئی اُس کا مقابل نہ مماثل نہ بدل
اوجِ رفعت کا قمر نخلِ دو عالم کا ثمر
بحرِ وحدت کا گہر چشمۂ کثرت کا کنول

مہرِ توحید کی ضَو اوجِ شرف کا مہ نَو | شمعِ ایجاد کی لَو بزمِ رسالت کا کنول
مرجع روح امیں زیب دہِ عرشِ بریں | حامیٔ دینِ متیں ناسخِ ادیانِ دِ ملل
ہفت اقلیم ولایت میں شہِ عالی جاہ | چار اطراف ہدایت میں نبیٔ مرسَل
دورِ خورشید کی بھی حشر میں ہو جائیگی صبح | تا ابد دَورِ محمدؐ کا رہے روزِ اوّل
شبِ اسریٰ میں تجلّی سے رُخِ انور کی | پڑ گئی گردنِ رفرف میں سنہری ہیکل
لطف سے تیرے ہوئی شوکتِ ایماں محکم | قہر سے سلطنتِ کفر ہوئی مستاصل

بحرِ امکاں میں رسولِؐ عربی دُرِّ یتیم | رحمتِ خاصِ خداوند تعالیٰ بادل
قبلۂ اہلِ نظر کعبۂ ابروئے حضورؐ | موئے سر قبلہ کو گھیرے ہوئے گویا بادل

دینِ اسلام تری تیغِ دو دم سے چمکا
یا اُٹھا قبلہ سے دیتا ہوا کاندھا بادل

مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ :-

اُن کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیئے ہیں | جس راہ چل گئے ہیں کوچے لبا دیئے ہیں
اُن کے نثار کوئی کیسے ہی رنج میں ہو | جب یاد آ گئے ہیں سب غم بھلا دیئے ہیں

اللہ کیا جہنم اب بھی نہ سرد ہو گا!
رو رو کے مصطفےٰؐ نے دریا بہا دیئے ہیں

لحد میں عشقِ رُخِ شہ کا داغ لیکے چلے
اندھیری رات سُنی تھی چراغ لیکے چلے

وہ کمالِ حسنِ حضورؐ ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دُور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

چند اشعار سلام کے بھی ملاحظہ کیجیے۔

مصطفیٰؐ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

شہر یارِ ارم، تاجدارِ حرم
نوبہارِ شفاعت پہ لاکھوں سلام

فتحِ بابِ نبوّت پہ بے حد دُرود
ختمِ دَورِ رسالت پہ لاکھوں سلام

کنزِ ہر بیکس و بے نوا پر دُرود
حرزِ ہر رفتہ طاقت پہ لاکھوں سلام

وہ کرم کی گھٹا گیسوئے مشک سا
لکّۂ ابرِ رافت پہ لاکھوں سلام

چشمۂ مہر میں موجِ نورِ جلال
اُس رگِ ہاشمیت پہ لاکھوں سلام

جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا
اُس جبینِ سعادت پہ لاکھوں سلام

جس کو بارِ دو عالم کی پروا نہیں
ایسے بازو کی قوّت پہ لاکھوں سلام

کعبۂ دین و ایماں کے دونوں ستوں
ساعدینِ رسالت پہ لاکھوں سلام

جس کے ہر خط میں ہے موجِ نورِ کرم
اُس کفِ بحرِ ہمّت پہ لاکھوں سلام

خندۂ صبحِ عشرت سو سو دُرود
گریۂ ابرِ رحمت پہ لاکھوں سلام

پارہ ہائے صحف، غنچہ ہائے قدس
اہلِ بیتِ نبوّت پہ لاکھوں سلام

آبِ تطہیر سے جس میں پودے جمے
اُس ریاضِ نجابت پہ لاکھوں سلام

وہ بتولِ جگر پارۂ مصطفیٰؐ
حجلہ آرائے عفّت پہ لاکھوں سلام

جس کا آنچل نہ دیکھا مہ و مہر نے
اُس ردائے نزاہت پہ لاکھوں سلام

سیّدہ زاہرہ، طیبہ طاہرہ
جانِ احمدؐ کی راحت پہ لاکھوں سلام

اہلِ اسلام کی مادرانِ شفیق
بانوانِ طہارت پہ لاکھوں سلام

جانثارانِ بدر و احد پر دُرود
حق گزارانِ بیعت پہ لاکھوں سلام

کاش! محشر میں جب اُن کی آمد ہو اور بھیجیں سب اُنکی شوکت پہ لاکھوں سلام
مجھ سے خدمت کے قدسی کہیں ہاں رضاؔ
مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

مولانا حسن رضا خاں حسنؔ بریلوی

مٹی نہ ہو برباد پسِ مرگِ الٰہی جب خاک اُڑے میری مدینہ کی ہوا ہو
دے ڈالئے اپنے لبِ جاں بخش کا صدقہ اے چارۂ دل دردِ حسنؔ کی بھی دوا ہو

گُلِ خلد کے بدلے زاہد تمہیں خارِ طیبہ دیدوں
مرے پھول تجھ کو دیکھے بڑے ہوشیار آئے!

وَرَفَعنَا لَکَ ذِکرَک کے چمکتے خورشید!
لامکاں تک ہیں اُجالے تری زیبائی کے

باغِ جنت میں نرالی چمن آرائی ہے کیا مدینہ پہ فدا ہو کے بہار آئی ہے
اُن کے گیسو نہیں رحمت کی گھٹا چھائی ہے اُن کے ابرو نہیں دو قبلوں کی یکجائی ہے
باغِ فردوس کو کھلا، فرش بچھا، عرش سجا اِک ترے دم کی یہ سب چمن آرائی ہے
چشمِ بے خواب کے صدقے میں ہیں بیدار نصیب آپ جاگے تو ہمیں چین کی نیند آئی ہے

شاد عظیم آبادی

اے اوّل ربیع اس آمد پہ میں نثار اُس کبریا کو دولت سرمدیہ میں نثار

الطاف وفیض ورحمتِ بیحد پہ ہیں نثار　　دی رحمتِ بہشت محمدؐ پہ ہیں نثار
دوزخ کا اب نہ خوف نہ دھڑکے عذاب کے
توحید خود بتائے رستے ثواب کے

جاتے ہیں سوئے عرشِ بریں خاتمِ رسلؐ　　لٹتے ہیں راستے میں ستاروں کے آج گل
حاضر ہیں انبیائے سلف آستاں پہ کُل　　ہے قدسیوں میں صلی علےٰ مصطفےٰؐ کا غُل
مہتابِ رُخ سوئے درِ دولت کئے ہوئے
استادہ کس ادب سے ہے مشعل لیے ہوئے

کرامت علی خاں شہیدیؒ :-

طلوعِ روشنی جیسے نشاں ہو شہ کی آمد کا　　ظہورِ حق کی حجت ہے جہاں میں نورِ احمدؐ کا
اُدھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل　　خواص اس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدّد کا
تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھوں　　قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقیّد کا
خدا اللہ چوم لیتا ہے شہیدی کس محبت سے
زباں پر میری جس دم نام آتا ہے محمدؐ کا

لُطف بدایونی :-

رُخِ مصطفےٰؐ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری دیدۂ چشمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

سراپا کا انداز بھی دیکھ لیجئے۔ سراپا لکھنے کی ہر نعت گو نے کوشش کی ہے مگر محسن کاکوروی کا سراپا، اُردو زبان کی شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اور شہرت و مقبولیت کے اعتبار سے بھی عالمگیر ہے۔ مقبولیت کا یہ حال کہ کہتے ہیں، کہ کوئی شخص عشاء کی نماز کے بعد اور سونے سے پہلے پڑھے تو ایک ہفتہ کے اندر حضور کی زیارت سے مشرف ہو کر رہے۔ چنانچہ سراپا اس مقصد کے لئے خاص طور پر پڑھا جاتا ہے۔

تمہید کے اشعار کو چھوڑتے ہوئے سراپا کے اشعار لکھے جاتے ہیں۔ اور ان میں سے بھی بعض اشعار کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

جسم محبوبِ خدا نور کا ایک پتلا ہے سایۂ حق وہ شہ منزلتِ طابا ہے
اس کے قامت کو بھلا سایہ مناسب کیا ہے سچ ہے محبوب جولاثانی ہے وہ یکتا ہے

لاکھ عاشق ہوں مگر لطف دو محبوب نہیں
ظلِ حق ہو تو ہو پر ظلِ نبیؐ خوب نہیں

قد کے اوصاف رکھو یاد نہ بھولو بخدا سجدۂ سہو نہیں ایسی عبادت میں روا
آب آئینۂ باطن سے وضو کر کے ذرا اِنّی وجّہت کرو نیتِ صادق سے ادا

اُٹھ کھڑے ہو لیے تعظیم دمِ طاعت ہے
یہی تکبیر ہیں عشاق کی قد قامت ہے

سر اقدس ہے حبابِ لبِ دریائے قدم دُرّۃ التاج ہے اس بحر کا یہ قطرۂ نم
میم احمد کا ہے دامانِ احد سے منضم یوں حدوث اور قدم آکے ہوئے ہیں باہم

قطرہ جز نیست کہ انہ بحر جدا ئم ہمہ
بحر و بر قطرہ بجستند یدکر ہا ئم ہمہ

لیے امت کے گنہ آپ نے اپنے سر پر بخشش حق ہو نہ ہم پر متوجہ کیونکر
دن گنے جاتے ہیں کب روز شمار آئے نظر زلفِ مشکیں کو دکھا کر کہیں پیغمبرؐ

ہاں چلو حشر کے بازار کا سودا دیکھو
نقدِ سرمایۂ اُمّت کا سیاہا دیکھو

سایہ ہے فرقِ ہمایوں پہ جنابِ حق کا   پر و بالِ فرشتہ پر نہیں کھولے ہے ہما
عالمِ غیب کا سردار ہوا جلوہ نما   نہیں سرکار پہ سلطانِ حبش کی حاشا
کشورِ کاکُلِ پُرپیچ و خم سرور ہے
نہ ختن ہے نہ خطا ہے نہ یہ عنبر سر ہے

خوشنویسِ ازلی کا ہے وہ پُرزور قلم   کہ ہر اک حرف ہے اس کا سندِ مستحکم
اہلِ ایماں کے لیے موئے سرِ شاہِ امم   خطِ گلزار میں ہے سرخطِ گلزارِ ارم
کوچۂ خلد نظر آنے لگا دُنیا میں
خوب فردوس یہ لکھا ہے خطِ طغرا میں

رُخِ پُرنور کا ہے کاکُلِ شبگوں سے ظہور   دیکھ لو دامنِ موسیٰؑ کے تلے شعلۂ طور
سُنبلے میں ہے عیاں جلوۂ ماہِ پُرنور   ابرِ رحمت میں ہے خورشیدِ قیامت مستور
شبِ معراج میں ہے شمعِ تجلّی روشن
لیلۃ القدر میں ہے نورِ الٰہی روشن

وصفِ پیشانی میں ہوتا ہے قلم سر بزمیں   لوحِ بسم اللہ ابرو جبینۂ کعبہ بہ یقیں
مصحفِ گل ہے رُخِ خاتمۂ نسخۂ دیں   سورۂ فاتحہ مصحفِ گل ہے وہ جبیں
گلشنِ عالمِ تنزیہ رُخِ زیبا ہے
گلستانِ مقدس کا یہ دیباچہ ہے

ہیں دو ابروئے سیہ زیبِ جبینِ انور   طاق یا خانۂ خورشید کے آتے ہیں نظر
نقشۂ ابرو کا دکھائے جو عطارد لکھ کر   مہِ نو تیغ سے مریخ کی ہو دو پیکر
خواب میں بھی جو وہ زہرہ سی جبیں پیش آئے
مشتری طالعِ کنعاں کی زحل ہو جائے

دیکھو ہم پہلوئے پیشانیِ انور ابرو — ہیں اسی آئینۂ صاف کے جوہر ابرو
آبروئے دمِ خنجر ہیں مقرر ابرو — موجِ دریائے شجاعت میں سراسر ابرو
مہِ کامل ہیں مہِ نو کی یہ تصویریں ہیں
یا کھنچیں معرکۂ بدر میں شمشیریں ہیں

اک رگِ خشمی ہے مابینِ دو ابروئے سیاہ — کہ نظر آتی ہے وقتِ غضبِ شاہنشاہ
طرفہ تشبیہ پہ پہنچی ہے سخنداں کی نگاہ — الفِ اسم چھپائے ہوئے ہے بسم اللہ
لفظ و معنی ہیں عجب ابروئے حق کے طاق ہوئے
الفِ طاق چھپایا تو عدد طاق ہوئے

رگ جو کاٹا ہے تو شاہین ترازو ابرو — مردمک سنگ ہے اور پلہ ہے چشمِ دلجو
آنکھ پڑ جائے اگر جانبِ امت سرمو — صاف رکھی رہے میزانِ قیامت یکسو
اپنے پلّہ پہ ہمارے ہوں تو کیا کھٹکا ہے
مردمِ چشم کہیں ہم نے اسے تولا ہے

طرفہ مضمون ہے مجھے پیشِ نظر ہو آگاہ — منظرِ چشمِ نبی پر بھی ذرا کیجیے نگاہ
ایسی نرگس کہیں ہے نہ بادامِ سیاہ — چشمِ بد دور عجب آنکھ ہے ماشاء اللہ
لاکھ اگر اچھی سے اچھی کوئی تشبیہ کہے
چشمکیں مارے سخن گوئے نظر فیہ کہے

اک نیا نسخہ نکالوں دلِ پرجوہر سے — صفحۂ پر سیم کے لکھیں جسے آبِ زر سے
پلکیں اکسیر کی بوٹی ہیں سنا اکثر سے — بوتۂ چشم پہ ہے آبِ رخِ انور سے
صدقے اے دولتِ بیدار ترے سونے کے
ڈھیلے آنکھوں کے نہیں ڈھیلے ہیں یہ سونے کے

گوش پر لو ترے زلفِ شبِ اسرا مستور — کہیں دھوکے سے بھی دیکھے تو سحر ہو کافور
رنگ کانوں کے صبا اُن کے چمن میں نہ کہہ — کہے گل سے کہ ہوا ہو نہ ٹھہر میرے حضور

گوہرِ وصف سے گر دامنِ دریا پُر ہو
یوں صدف سے کہے موتی کہ لبِ جیب دُر ہو

سرِ فلک گوش قطبِ گرچہ پہ تشبیہ ہے تیز   چشم کا یہ ہے اشارہ کہ کرو اس سے گریز
ہے زمیں کعبۂ ابرو کی ہر ٹری مردم خیز   رُخ کے میداں میں ہر اک ذرہ شمس تبریز
گوش و بینی کو یہی دیکھ کے سب کہتے ہیں
قطب و صاحبِ انفاس یہاں رہتے ہیں

بینیِ اقدسِ شاہنشہِ عالی منظر   آبِ آئینۂ رخسار کی موجِ انور
خوبروئی کا بلندی پہ ہمایوں اختر   یوسفِ حُسن کا معراج ہے یا چشمِ نظر
صفحۂ خدِ مبارک پہ الف بینی ہے
دیکھنا عارضِ انور کا خدا بینی ہے

صورتِ چشمۂ کوثر ہے لبِ جاں پرور   نخلِ بادام وہ بینی ہے لبِ کوثر پر
شاخ اُس نخل کی ابروئے جنابِ اطہر   اور اُس شاخ کی عینینِ مبارک میں ثمر
دلِ عارف اسی کے سایہ میں دم لیتا ہے
نورِ ایماں اسی سایہ کے قدم لیتا ہے

چشمۂ مہر سے اس بحر میں اب رونق ہے   صفحۂ ماہ تک انگشت قلم سے عاشق ہے
وصفِ رخسار ادا کرنے کا مجھ پر حق ہے   رنگِ رخسارِ سحر سامنے حسن کے فق ہے
مطلعِ صبح بیاضی ہے کہ نورانی ہے
حسنِ مطلع یہ مگر فرد ہے لاثانی ہے

روبروئے جو آئینہ تو اک سکتا ہو   شمع کے بھی دھوئیں اڑ جائیں جو کچھ دعویٰ ہو
شامت آجائے جو خورشید کو یہ سودا ہو   صبح ہو جائے قمر حسن پہ گر بھولا ہو
حشر برپا ہو جو کنعانی مقابل آئیں
چرخ پر سورۂ یوسف کو ملک لے جائیں

روبروجلوۂ خورشید کے سایہ کیا ہے! سامنے شمع منوّر کے اندھیرا کیا ہے!
عاقلو غور سے دیکھو کہ یہ نکتہ کیا ہے اُمّی ہونے میں بھلا آپ کے شبہ کیا ہے

کوئی تدبیر تو بڑھنے کی بجا ہی نہ رہی
نورِ رخسار سے حرفوں میں سیاہی نہ رہی

لبِ جاں بخش کی تشبیہ دمِ عیسیٰؑ سے دی نہ دم دیتے رہے گرچہ مسیحا بھی مجھے
آبِ حیواں نہ کہا، خضر نے گو چھینٹے دیئے اب فقط رہ گئے خورشید کے جھوٹے شوشے

کہوں یاقوت تو وہ باتیں لباں پائی نہیں
لعل سمجھوں اُسے آنکھیں میری پتھرائی نہیں

فکرِ وصفِ دُرِ دنداں میں کیا سارا دن رات بھر تارے ہی گنتے رہے بیٹھے محسنؔ
جس کی تشبیہ نہ ہو اُس کی صفت کیا ممکن یوں تو ثابت ہے کہ سیارے بھی ہیں اور روشن لیکن

غور سے دیکھئے تو صبح کے یہ چھالے ہیں
یا لبِ ساغرِ افلاک کے تبخالے ہیں

اے سخن داں کیے اسرارِ دہن کس نے بیاں مل گیا خاک میں جو چشمۂ آبِ حیواں
پہنچے ہیں حقۂ گوہر کے جگر تک دنداں دُرجِ یاقوت میں ہے آتشِ حسرت کا دھواں

رنگِ غنچہ کا اُڑا گُل کی تعلّی چھوٹی
منہ پہ پستہ کے ہوائی بہ ہوائی چھوٹی

کوئی کہتا ہے کہ اس کو شکرستان کہئے کوئی کہتا ہے ملاحت کا نمکداں کہئے
خضر بولے کہ اُسے چشمۂ حیواں کہئے اور سلیماںؑ نے کہا خاتمِ یزداں کہئے

ہر جگہ مشتہر اس کا لقب تازہ کیا
حق تعالےٰ نے اسے صاحبِ آوازہ کیا

غنچہ نے پیش کئے گرچہ ہزاروں مضموں گفتگو اس میں ہے، بولی مری طبعِ موزوں
ہیں شگافِ قلمِ صنع اُسے کیوں نہ کہوں جس سے ظاہر ہوا سرِّ خفی کن فیکوں

شعرا نے اُسے کیا جانئے کیا کیا سمجھا
اسمِ اعظم کا مگر ہم نے معمّا سمجھا

ریشِ مرسل کو نبوت کا رسالہ کہیئے — کششِ خط، شکستِ دلِ اعدا کہیئے
سرِ فرمانِ خدا کا خطِ طغرا کہیئے — کلکِ تقدیر کا یا خطِ شفیعا کہیئے

اس کی رواداری سے اللہ نے بخشا ہم کو
ہے شفاعت کی سند خطِ شفیعا ہم کو

رُخِ مُصحفِ نور ہے قرآں کا پہلا نسخہ — ہاتھ سے اپنے جسے خاص مصنّف نے لکھا
مشکل ازبسکہ تھا مضمونِ دہن کا نکتہ — اس لئے حاشیہ لکھا ہے خطِ رنگیں کا

رخ جو ایماں ہے تو اک جزو ہے یہ ایماں کا
ہے نیا حاشیہ یہ منہیۂ قرآں کا

نگہِ پاک الف صاد ہے چشمِ زیبا — لام گیسو ہیں سرِ مو نہیں کچھ فرق اصلا
چہرہ یہ ہے خطِ گلزار سے یعنی لکھا — کہ وہ ہے اصل پئے خلقتِ دین و دنیا

جمع خاطر ہو تو یکجا یہ مضامین کیجے
دیکھیں تضمینیں بہت ان کی تفہیم کیجے

ہے وہ کعبہ ہے گیسوئے حبیبِ یزداں — اور محرابِ حرم کا ہے اُس ابرو پہ گماں
اس میں پاکیزہ مصلّا ہے نگہ کا داماں — مردمِ چشم ہے بیٹھا ہوا اک ناظرہ خواں

زیرِ رخسارِ مبارک وہ خطِ ریشِ لطیف
رحل ہے جس پہ کُھلا رکھا ہے قرآنِ شریف

لو لگائے ہے یہی روشنیِ طبعِ والا — شمع کافوریِ گردن کا دکھائے نقشا
نہیں پروانگی پاتی ہے مگر فکرِ رسا — پَر یہاں جلتے ہیں جبریلؑ کے اندیشہ کا

سرفرازی اسی گردن کو بہت زیبا ہے
آتشِ حسنِ گلوسوز کا یہ شعلہ ہے

بارک اللہ وہ گردن ہے کہ فوّارۂ نور   جس سے ڈوبی عرق شرم میں ہے شمع طور
کیسی مینا و صراحی کا یہاں کیا مذکور   بزم تنزیہہ کی کہئے اسے مینائے طہور

جس کی کیفیت اگر دیدۂ باطن میں نہ آئے
خلد میں شربت دیدار حق اچھوتا ہو جائے

بال گردن پہ جھک آئے تو ہوا یہ روشن   کہ شب فکر میں افروختہ ہیں شمع سخن
ہے تجھے کس لئے اے خامۂ ایجاد الجھن   انتخابی ہیں سب اشعار بیاض گردن

ہر شب و روز چہ آشفتہ بسر می بردی
تا کہ مسودۂ گیسو بہ بیاض آوردی

صفت مہر نبوّت کا بیاں ہو کیوں کر   خامشی مہر دہن اور سخن ہے ششدر
مہر کی پشت کے نقروں سے یہ حق نے لکھا   کہ ہوا نامۂ پیغامبری ختم اس پر

ہوئے پھر بھی جو سیہ دل متنبی گمراہ
ختم اللہ علیٰ قلبہم انا اللہ

دست رنگیں کی صفت بار خدایا کیا ہے   شاخیں نکلیں جو کہوں شاخ گل رعنا ہے
طوطی ناطقہ اس باغ میں چپ رہتا ہے   بلبل طبع کو غنچہ کی طرح سکتا ہے

ہاتھ باندھے ہوئے جبریل کھڑے رہتے ہیں
دست گلچیں کو یہاں دستۂ گل کہتے ہیں

بندہ دست آپ کا ہے یا کوئی مخمسہ کا بند   طبع استاد ازل بھی ہے عجب ماہر بند
انگلی ہر ایک ہے وہ مصرع موزون و بلند   انگلی رکھ سکتے نہیں جس پہ کہیں دانشمند

مجھ کو فخر صفت پنجۂ اقدس بس ہے!
اس مسدس کے شرف کو یہ مخمس بس ہے

گو کف دست منوّر کو میں کہتا ہوں ماہ   غور کیجئے کہ یہ تشبیہ نہیں خاطر خواہ
مہر انور ہے ہتھیلی یہ مہ نو ناخن شاہ   دونوں جس وقت مقابل ہوئے اللہ اللہ

ہم نے یہ معجزۂ عقدِ انامل دیکھا
اک گھڑی میں مہِ نَو کو مہِ کامل دیکھا

کون لکھے صفِ سینۂ صافِ سرورؐ — دست بر سینہ ہیں حسرت سے یہاں حق و بشر
اور کہتے ہیں فرشتے بھی حیراں ہو کر — لوحِ محفوظ ہے یا عرش خدا بیشِ نظر
صدرِ ایوانِ رسالت کا عجب سینہ ہے
صورتِ علمِ لدُنّی کا یہ آئینہ ہے

صاف وہ بے موئے نبیؐ کا بر سیمیں شفاف — جیسے لفظوں سے حرف الگ صدر رگ ہیں صاف
ہاں مگر سینہ سے ہے اک خطِ مشکیں تا ناف — جس کو کہتا ہے سخنور کششِ مرکزِ قاف
صدرِ پُر نور کے شق ہونے کی تمثال ہے یہ
عقل کہتی ہے وہ آئینہ ہے اور بال ہے یہ

مخزنِ گوہر اسرار شبِ اسریٰ ہے — شرحِ صدرِ شہِ عالی کا یہ اک نکتہ ہے
جو کہ لبریزِ لطافت ہے یہ وہ چشمہ ہے — جس میں امواج لطائف ہیں یہ وہ دریا ہے
خط نہیں سینۂ شاہنشہِ بحر و بر کے
عنبریں موج ہے یہ بحر میں گویا بر کے

گرچہ پرواز میں اندیشہ ہے بالِ جبریلؑ — اور آجیائے مضامیں میں ہے فکر اسرافیلؑ
نہ ملی پر کوئی نازک سی کمر کی تمثیل — ہو گیا ہم عددِ لفظِ عدم لفظِ عدیل
قاف تک ہم نے بہت قافِ کمر ڈھونڈا ہے
کمریں دیکھی ہیں پر ایسی کمر عنقا ہے

ہیچ اس جا ہے کسی تیغ و کمر کا مذکور — اس کے اوصاف میں مشہور میانِ جمہور
تا کمر غرقِ عرق ہو گئے سب اہلِ غرور — سامنے اس کے اوصاف میں مشہور میانِ جمہور
سُن کے اوصاف شجاعانِ جہاں گھبرائیں
چیتے میداں میں جو آئیں تو ہرن ہو جائیں

لا خطِ نسخ میں لکھو تو کہوں اک نکتہ   لام الف کا ہے تقاطع وہ کمر صلی علیٰ
واہ کیسا کمروں پہ یہ خطِ نسخ کھینچا   کمرِ یار کو معدوم ہی سمجھے شعرا
نہیں ثابت قدم اس نفی سے استثنا بھی
یہ وہ لا ہے کہ نہیں اس سے بچا الا بھی

سرِ عالم ہے فدائے قدمِ پاکِ نبیؐ   وصف میں جس کے سخنداں کا لگا گھٹنے جی
ہاتھ آیا ہے جو کاغذ تو یہ حسرت ہے نئی   نہیں چلتا ہے، لگی پائے قلم میں مہندی
سربزانوئے ادب آ کے سخن گو بیٹھیں
فکرِ عالی کے فرشتے بھی دوزانو بیٹھیں

دیکھئے کیا اُسے شمشاد و صنوبر سے مثال   چمنستانِ ارم اس کے قدم سے ہے نہال
سروِ جنت سے نکل آئیں پئے استقبال   کہے سبزہ کہ مجھے شوق سے کیجئے پامال
مثلِ بلبل کے سرِ راہ بچھائیں گُل چشم
فرشِ فردوس گلابی ہو تو ہو بلبل چشم

شور ہے عالمِ بالا پہ قدِ رعنا کا   سرِ افلاک ہے فدیہ قدمِ والا کا
ساق ہے نخلِ تمنائے ملاءِ اعلیٰ کا   خاکِ پا غازہ ہے حوروں کے رُخِ زیبا کا
رکھ دیا آپؐ نے جس فرش پہ دوبارہ قدم
بڑھ گیا پایہ میں وہ عرش سے بھی چار قدم

بزم میں تذکرۂ پائے نبیؐ گر سن پائے   شمع گو رشک سے جل جائے مگر سر نہ اُٹھائے
ناخنِ پا جو ذرہ عقدہ کشائی پر آئے   گرہ ابروئے خوباں کی حقیقت کھل جائے
ماہِ نو گر کہیں ہم چشمی کا خمیازہ کرے
ناخنہ چشمِ فلک میں خلشِ تازہ کرے

لو مبارک ہو قدم بوسی حضرتِ محسنؔ   کس کو ہوتی ہے نصیب ایسی سعادت محسنؔ
اب نہیں باقی ہے کچھ خواہشِ ہمت محسنؔ   آرزو اتنی ہے بس روزِ قیامت محسنؔ

مر کے بل جاؤں جو نقشِ قدم سرورؐ پر
صاف محشر کی زمیں رکھ لوں اُٹھا کر سر پر

ہے یہ اُمید کہ جب گرم ہو بازار نشور
یوں کہیں بادشہ بارگہِ عالمِ نور

لو سراپا ہمیں تم دو عوضِ حور و قصور
میں کہوں واہ مجھے یہ نہیں ہرگز منظور

مفت حاضر ہے مگر اس کی یہ تدبیر نہیں
کھوٹے داموں بکے یوسفؑ کی یہ تصویر نہیں

بہر حال ہم نے اقبالؔ سے پہلے کے تمام شعراء کا نعتیہ کلام پیش کر دیا ہے۔ وہ کلام بھی جس میں انتہائی جوشِ محبت اور نہایت درجہ وارفتگی عشق کے عالم میں حضور اکرمؐ کی جناب میں ہدیۂ عقیدت و نیاز پیش کیا گیا ہے۔ حضورؐ کے ظاہری حسن و جمال کی تعریف کی گئی ہے، حضورؐ کے معجزات اور خرقِ عادات بیان کئے گئے ہیں۔ معراج کی تعریف میں زورِ طبع، زورِ قلم اور فکرِ رسا کی بلند پروازی دکھلائی گئی ہے۔ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے حضورؐ کی رحمۃ للعالمینی کا حوالہ دے کر حضورؐ کو اپنی طرف متوجہ ہوتے اور قیامت کے ہنگامۂ دار و گیر میں حضورؐ کی شفاعت کے لئے درخواست کی گئی ہے۔ حضورؐ کا سراپا لکھنے میں شاعری کا کمال دکھلایا گیا ہے۔ اور حضورؐ کے دوبارہ تشریف لانے، دنیا کی موجودہ ابتری و بدحالی اور اسلام کی سرنگونی کو دیکھنے اور پھر ایک دفعہ دنیا میں امن و خوش حالی اور اسلام کو سربلند کرنے کی تمنا کی گئی ہے۔ اور وہ کلام بھی پیش کر دیا ہے جو اس انداز سے ہٹ کر حضورؐ کی

دوسری ہمہ گیر صفات کی تعریف کا حامل ہے۔ لیکن اقبالؔ کا رنگ ان سب سے الگ ہے۔ اور یہ بات شعرائے ماسبق کے اس دوسری قسم کے کلام میں بھی نہیں ملتی۔ اور اگر کچھ جھلکیاں نظر آتی ہیں تو وہ نہایت مدھم اور ناواضح ہیں۔ یعنی حضورؐ کے وہ اوصاف جو آدمؑ سے لے کر آج تک کسی انسان میں جمع نہیں ہوئے۔ اور جو نوعِ انسانی کی ہر شعبۂ حیات میں رہنمائی کرتے ہیں ۔۔ اور کیسی رہنمائی؟ وعظ و پند ہی کی زبان سے نہیں بلکہ عمل کا نمونہ دکھلا کر۔ نیز قوم کا تصوّر اور چونکہ حضورؐ کو امت سے انتہا درجہ کی محبت تھی اس لئے قوم سے ایسی محبت کہ قوم کے مقصد کے پیشِ نظر اپنے ذاتی و انفرادی مقصد کی مطلق پرواہ نہ کرنا۔ یہ بات بھی کسی کے ہاں اس خوبی کے ساتھ نہیں ملتی اسلام سے پہلے دنیا کی حالت کیا تھی، اور حضورؐ کی تعلیم سے کیا ہو گئی۔ اور کس طرح ہو گئی۔ اور موجودہ عالمگیر فسادِ اخلاق و آدمیت اور اسلام کی پستی و زبوں حالی کس طرح دُور ہو سکتی ہے۔ غرض کہ سیرتِ پاک کے تمام نہ سہی خاص خاص پہلو ہی سامنے آجاتے۔ معجزات سے تو اسی وقت کے لوگ اور وہ بھی وہی متاثر ہو سکے تھے جو خود ذاتِ رسالتمآبؐ کی طرف سے چشم و گوش بند کر کے معجزے دیکھنا چاہتے تھے۔ حضورؐ کے وہ محامد و فضائل جو دُنیا میں ایسے پاکیزہ انقلاب کا باعث ہوئے۔ جس کی مثال تاریخ کے صفحات میں نہیں ملتی۔ اور جو دنیا کی تاریخ میں آج بھی آفتاب کی طرح درخشاں ہیں۔ اور آج ہی نہیں قیامت تک دنیا ہدایت حاصل کرتی رہیگی۔ اور امن و اطمینانِ خاطر، خوشحالی و اقبال مندی جس کا لازمی نتیجہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان صفات کا بیان کس نے کیا اور حضورؐ کے اِن احسانات کو کس نے گنوایا۔ اس لئے کہ نوعِ انسانی کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے۔ اقبالؔ نے یہی کام کیا ہے۔ انہوں نے اسلام کو بھی

سمجھا اور حضور اکرمؐ کی ذاتِ والا کو بھی اور حضورؐ کے ان اوصاف ہی کو زیادہ بیان کیا ہے اور نئے نئے اسلوب اور موثر پیرائے میں بیان کیا ہے جو زندگی کے ہر ہر قدم پر ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ اور جن پر عمل پیرا ہونے سے آج بھی دنیا کا کلبش دور ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ اقبالؔ حضورؐ کے ان اوصاف سے تاثر عشق کے درجہ تک پہنچا ہوا ہے اس لئے انہوں نے اس پیکرِ حسن و جمال کی سیرتِ پاک کے ایک ایک واقعہ اور آپؐ کی رفتار و گفتار کی ایک ایک ادا کی تعریف ایسی وارفتگی اور شیفتگی کے ساتھ کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ہر ادا پر جان و دل نذر کرنے کو تیار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ایک ایک بول دلوں میں تیر و نشتر کی طرح اترتا چلا جاتا ہے۔

اسی طرح تمام ماسبق شعراء کے ہاں ملّت کا تصوّر .... (CONCEPTION OF NATION) بھی قریب قریب ناپید ہے۔ زیادہ تر شعراء نے حضورؐ کی جناب میں اپنا ہی رونا رویا ہے اور اپنی ہی طرف سے ہدیۂ نیاز پیش کیا ہے۔ اور حضورؐ کے لطف و کرم کی درخواست اپنی ہی ذات کے لئے کی ہے قوم کا خیال مطلق نہیں آیا ہے۔ حالانکہ حضورؐ کے عشق کا تقاضا یہ ہونا چاہئے تھا کہ جس قوم کو حضور اس قدر چاہتے تھے اس کو فراموش نہ کیا جاتا۔ اور حضورؐ کی جناب میں اس کی ابتری و زبوں حالی کا رونا رویا جاتا اور اس کے درد کا مداوا طلب کیا جاتا تاکہ قوم کے ساتھ خود بھی حضورؐ کی توجہ سے فیض یاب ہو جاتے اگر اس سے آگے بڑھے تو جمع کے صیغہ کے ساتھ کچھ شکایتِ زمانہ یا مصائبِ روزگار کا بیان کر دیا ہے۔ کہ ہمارا حال بہت زبوں ہے، زمانہ ہمارا دشمن ہے، حضورؐ کے سوا ہمارا کون ہے جس سے اپنا

حالِ زار کہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھے تو ساری دنیا کی خرابی و ابتری کو بیان کر دیا ہے کہ حضورؐ دنیا میں گناہوں کا اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا ہے۔ ظلم و ستم اور دکھ درد کی انتہا ہو چکی ہے اب آپؐ ہی تشریف لائیے اور دنیا کی حالت کو بدل لئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حال دنیا ایسا خراب کیوں ہے — یہ مصائب و آلام کا طوفان کیوں آیا ہوا ہے — سکون خاطر اور اطمینانِ دل کیوں ناپید ہو گیا ہے۔ اس پر کسی نے توجہ نہیں کی ہے۔ الّا ماشاءاللہ۔

ملّت کا تصوّر اور حضورؐ کی عالم آرا صفات کا بیان سب سے پہلے اردو شعراء میں حالی نے کیا ہے۔ اور حالی کے بعد اقبال نے اس عرش تک پہنچا دیا۔ مسدّس مد و جزرِ اسلام میں چند ہی بند لکھے ہیں مگر یہی بند تخم ریزی تھی اس برگ و بار کی جو اقبال کی طبع وقاد اور ذہنِ نقاد سے ظاہر ہوئے۔

حالی فرماتے ہیں ؎

ہوئے محوِ عالم سے آثارِ ظلمت — کہ طالع ہوا ماہِ برجِ سعادت
نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدّت — کہ تھا ابر میں ماہتابِ رسالت
یہ چالیسویں سال لطفِ خدا سے
کیا چاند نے کھیت غارِ حرا سے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگذر کرنے والا — بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کا شیر و شکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مسِ خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اسکی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رُخ ہوا کا

پڑی کان میں دھات تھی اک نکمی
نہ کچھ قدر تھی اور نہ قیمت تھی جس کی
طبیعت میں جو اس کے جوہر تھے اصلی
ہوئے سب تھے مٹی میں مل کر وہ مٹی
یہ تھا ثبت علمِ قضا و قدر میں
کہ بن جائے گی وہ طلا اک نظر میں

وہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبر!
تمام اہلِ مکہ کو ہمراہ لے کر
گیا ایک دن حسبِ فرمانِ داور
سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر
یہ فرمایا سب سے کہ "اے آلِ غالب"
"سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب؟"
کہا سب نے "قول آج تک کوئی تیرا
کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا"
کہا "گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا
تو باور کرو گے اگر میں کہوں گا؟"
کہ فوجِ گراں پشتِ کوہِ صفا پر
پڑی ہے کہ، لوٹے تمہیں گھات پا کر"
کہا "تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے
کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے"
کہا "گر مری بات یہ دلنشیں ہے
تو سن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہے
کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا"

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی　　عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی　　اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اُٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

اس کے بعد بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے اُس گمراہ قوم کو کیا کیا سکھایا۔ اُن کی کون کون سی بُرائیوں کو چھڑایا اور بُرائیوں کے بجائے اُن میں کیا کیا محاسن پیدا کئے۔ غرض کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے ریگستانِ عرب دفعتہً ایک سدا بہار باغ بن جاتا ہے۔ مسلمان اقوامِ عالم پر دینی و دنیاوی ترقیات کے اعتبار سے سبقت لے جاتے ہیں۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن میں دُنیا کی رہنمائی کرتے ہیں۔

اسی طرح مسدس کے آخر میں عرضِ حال کی ہے۔ تو اس میں اسلام اور مسلمانوں ہی کی حالت پر خون کے آنسو رو ئے ہیں ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے　　اُمّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے　　پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی سیزر و کسریٰ　　خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے
جس دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں　　اب اُس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے
جس دین نے غیروں کے تھے دل آ کے ملائے　　اُس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے
جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا　　اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے
جس دین کی حجت سے سب ادیان تھے مغلوب　　اب معترض اُس دین پہ ہر ہرزہ سرا ہے
ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی　　دینداروں میں پر آب ہے باقی نہ صفا ہے
یاں راگ ہے دن رات تو واں رنگ شب و روز　　یہ مجلسِ اعیاں ہے وہ بزمِ شرفا ہے

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدّت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

جس قصر کا تھا سر بہ فلک گنبدِ اقبال
ادبار کی اب گونج رہی اُس میں صدا ہے

بیڑا جو نہ تھا بادِ مخالف سے خبردار
جو چلتی ہے اب چلتی خلاف اس کے ہوا ہے

وہ روشنیِ بام و درِ کشورِ اسلام
یاد آج تلک جس کی زمانے کو ضیا ہے

روشن نظر آتا نہیں واں کوئی چراغ آج
بجھنے کو ہے اب گر کوئی بجھنے سے بچا ہے

جو قوم کہ مالک تھی علوم اور حِکَم کی
اب علم کا واں نام نہ حکمت کا پتا ہے

کھوج اُن کے کمالات کا لگتا ہے اب اتنا
گم دشت میں اک قافلۂ بے طبل و درا ہے

نقش

بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہیں بنتی
ہے اس سے یہ ظاہر کہ یہی حکمِ خدا ہے

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہے زمانہ کا نہ قسمت کا گلا ہے

دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت
سچ ہے کہ بُرے کام کا انجام بُرا ہے

فریاد ہے اے کشتیٔ امّت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

اے چشمۂ رحمت بِاَبِی اَنْتَ وَ اُمّی
دنیا یہ تیرا لطف عام رہا ہے

کر حق سے دُعا امّتِ مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے

اُمّت میں تیری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبّت تیری عترت کی ولا ہے

ہر چپقلشِ دہرِ مخالف میں ترا نام
ہتھیار جوانوں کا ہے پیروں کا عصا ہے

جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف
اب تک وہی قبلہ تیری اُمّت کا رہا ہے

جس ملک نے پائی تری ہجرت سے سعادت
کعبے سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہے

کل دیکھیے پیش آئے غلاموں کو ترے کیا!
اب تک تو ترے نام پہ اک دل فدا ہے

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمہارے
نسبت بہت اچھّی ہے اگر حال بُرا ہے

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی — ہاں ایک دعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے
خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں — پر فکر ترے دین کی عزت کی سدا ہے
گر دین کی جوکھوں نہیں ذلت سے ہماری — امت تری ہر حال میں راضی بہ رضا ہے
عزت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں — اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلت میں مزا ہے

ہاں حالیؔ گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہے

آپ نے دیکھ لیا کہ حالیؔ کے تقریباً وہ تمام باتیں موجود ہیں جن کو ہم نے اقبالؔ کے نعتیہ کلام کی خصوصیات قرار دیا ہے۔ یعنی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے وہ پہلو جو ہماری زندگی کے ہر راستے میں رہنمائی کرتے ہیں، قوم و ملت کا مکمل تصور جو اسلام نے متعین کیا ہے۔ اور قوم کے لئے اپنی ذات کو فراموش کر دینا۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ وہ شراب جو حالیؔ نے تیار کی تھی اس کو اقبال نے بہت زیادہ تند و تیز کر دیا ہے۔ کیا تفصیل و توضیح کے اعتبار سے اور کیا اثر انگیزی و دل نشینی کے لحاظ سے نیز انہوں نے ان باتوں کو بار بار مختلف پیرایوں میں بیان کر کے سمجھانے اور دل میں اتار دینے کی بھی بڑی کامیاب کوشش کی ہے بلکہ ایک خاص امتیازی شان یہ بھی پیدا کی ہے کہ حالیؔ کے ہاں شروع سے آخر تک یاس ہی یاس کا سماں دکھلایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ امید کے ساز سے بھی ناامیدی ہی کے سُر نکلتے ہیں۔ اس کے برخلاف اقبالؔ کے ہاں امید کی کرنیں پھوٹتی اور کامیابی و کامرانی کی صبح نمودار ہوتی نظر آتی ہے۔
ان کی تعلیم تو یہ ہے کہ ؎

اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی

غرض کہ اگر حالیؔ کو تقدم کا شرف حاصل ہے اور وہ ایک ایسے معمار ہیں جس نے ایک عالیشان عمارت کا نقشہ بھی تیار کیا ہے اور اس نقشہ پر عمارت کی بنیاد بھی رکھی ہے تو اقبالؔ اُس عمارت کو فلک الافلاک تک لے جانے والے ہی نہیں بلکہ عمارت کی آرائش و زیبائش اور اس کے نقش و نگار کی دلکشی کو چار چاند لگا کر ایسا عجیب و غریب مرقعِ حسن و جمال بنا دینے والے بھی ہیں کہ جس کے جمال سے نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور اور جس کی بلندیوں کی طرف دیکھنے والے اپنی کلاہ و دستار کو سنبھالنے لگتے ہیں۔

بہر حال اس مقابلے میں "اقبالؔ اور عشقِ رسولؐ" کے تحت جو عنوانات ضروری ہو سکتے تھے ان کو خود اقبالؔ کی تحریرات، ان کے کلام اور پھر اُن کے احباب اور عقیدت مندوں کی شہادتوں سے واضح طور پر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس مضمون کا مقصد محض مضمون لکھ دینا نہیں ہے جیسا کہ جواب مضمون لکھنے والوں کے پیشِ نظر ہوتا ہے کہ ایک دیئے ہوئے عنوان کا خاکہ بنایا اور اُس میں ضروری معلومات کے ذریعہ رنگ بھر دیا اور بس اس کا منشا یہ ہے کہ ہم اُس حقیقت سے واقف ہو جائیں جو ہمارا دین و ایمان ہی نہیں ہے بلکہ دُنیا میں سربلندی اور آخرت میں نجات کا ضامن ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "ہم ہر چیز کو ترک کر سکتے ہیں۔ مگر عشقِ رسولِ اکرمؐ کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں دے سکتے" اس لئے کہ جب سے مسلمان اُس ہما کے سایہ سے محروم ہوئے

ہیں، نکہتِ وادیٔ یار کی وادیوں میں سرگرداں و حیراں پھر رہے ہیں۔ حالیؔ نے اپنے زمانے کے مسلمانوں کی حالتِ پرخون کے آنسو روتے ہوئے کہا تھا۔

اُمّت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے
ایمان جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبت، تیری عترت کی وِلا ہے

کیا یہ اشعار آج کے مسلمانوں پر بھی اسی حد تک صادق آتے ہیں؟ اگر صادق آتے ہیں تو اُس زمانے کے مسلمانوں کے مقابلے میں بھی آج کے مسلمانوں کی حالت کیوں خراب ہے؟ حالانکہ اُس وقت ان کے ... ہاتھوں سے حکومت جا چکی تھی اور اب ان کو حکومت بھی مل گئی ہے۔ اور ملک بھی حاصل ہو گیا ہے۔ وعدۂ خداوندی تو یہ ہے کہ "وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" اور مومن کی تعریف ـــ حضورؐ نے یہ فرمائی ہے۔ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَاَجْمَعِيْنَ" جو مجھے اپنے ماں باپ اور اپنی ہر چیز سے زیادہ نہ چاہے وہ مومن نہیں۔ جس کو اقبالؔ نے جوابِ شکوہ میں اس طرح ادا کیا تھا ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اور بعد میں بھی بے شمار موقعوں پر اسی بات کو مختلف اسلوبوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

مقالے کو ختم کرنے سے پہلے ایک ناگوار حقیقت کو بھی ناظرین کے سامنے رکھ دینا ضروری ہے۔ اگرچہ ہمارا مسلک یہ رہا ہے کہ

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

مگر مہر و وفا ہی نے ہم کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ اس ناگوار کو بھی گوارا کریں۔ کیا مہر و وفا اس کا نام ہے کہ جس شخص کا قوم کی محبت میں یہ حال ہو، اور جو اسلام کا ایسا شیدائی ہو جس کا سرسری سا بیان اس مقالے میں ہوا ہے۔ اس کی شخصیت پر نادان دوستوں یا دانا دشمنوں کی نازیبا حرکت سے حرف آتا نظر آئے اور اس کو برداشت کر لیا جائے؟ اور کیا مہر و وفا اسی کو کہہ سکتے ہیں کہ اپنی قوم کے کچھ پڑھے لکھے افراد نادانی یا غلط فہمی سے واقف نہ کیا جائے۔ اس غلط فہمی سے جو قوم کے لئے مضرت رساں اور خود ان کے حق میں خسر الدنیا و الآخرہ کا مصداق ہے؟ غرض کہ وہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ ہم اقبال کے بعض نام نہاد نیازمندوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے خیال کے مطابق چار قسم کے ہیں:-

اوّل وہ نیازمند ہیں جو اپنے خبیث طبع یا اسلام دشمن اشخاص اور اداروں کے ہاتھوں بک جانے کی وجہ سے اقبال کی ذات سے اُن باتوں کو منسوب کر رہے ہیں جن کو دشمنانِ اقبال بھی (اگر اقبال کے دشمن ہوں) ان کے ساتھ منسوب کرنے کی جراُت نہیں کر سکتے تھے۔ اور ان نیازمندوں

میں پیش پیش وہ ہیں جو حدیث کے منکر ہیں۔

دوسرے وہ ہیں جو اپنے آپ کو اقبال کا نیاز مند بھی کہتے ہیں اور اپنی... قابلیت اور فلسفہ دانی کی نمائش کے لئے اقبال ہی کے کلام اور تحریرات میں عیوب و نقائص بھی نکالتے رہتے ہیں۔ کبھی ان کو افکارِ مغرب کے سرقے کا الزام دیتے ہیں، اور کبھی تہذیب و تعلیم فرنگ کی بیجا دشمنی کی تہمت لگاتے ہیں۔ اور کبھی تاریخی واقفیت، تحقیق کی کمی اور جذبات سے کام لینے کا بہتان لگاتے ہیں۔ اور اس طرح چھوٹے منہ بڑی بات کہہ کر اپنا بول بالا کرنا چاہتے ہیں۔ انہی دوسری قسم کے نیاز مندوں میں ایک صاحب ہیں جو اُن تمام اشعار کو تو نہایت ضروری اور برمحل قرار دیتے ہیں جو اقبال نے مُلّا کی مذمت میں لکھے ہیں، یہاں تک کہ ایسے تمام اشعار کو جمع کر کے اُن کو ایک کتاب کی شکل میں بھی شائع کر دیئے ہیں، مگر اسی اقبال کے ان اشعار کو جو اُس نے تہذیب و تعلیم فرنگ کے خلاف لکھے ہیں، غیر ضروری اور بے محل بتلاتے ہیں۔ بلکہ ان اشعار میں سے ہر ایک کے بارے میں کوئی نہ کوئی فقرہ ایسا چُست کرتے ہیں کہ جس سے اقبال کی تضحیک کا پہلو نکلتا ہو، چنانچہ فرماتے ہیں "اقبال کے ہاں مغربی تہذیب کے متعلق زیادہ تر مخالفانہ تنقید ہی ملتی ہے۔ اور یہ مخالفت اس کی رگ و پے میں اس قدر رچی ہوئی ہے کہ اپنی اکثر نظموں میں جا و بے جا ضرور اس پر ایک ضرب رسید کر دیتا ہے۔ مجموعی طور پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اقبال کو مغربی تہذیب میں خوبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ اس کے اندر اور باہر فساد ہی فساد دکھائی دیتا ہے۔ گویا یہ تمام کارخانہ ابلیس کی تجلّی ہے۔ بعض نظمیں تو خالص اسی مضمون کی ہیں۔ اپنی غزلوں میں بھی حکمت و عرفان،

تصوّف اور ذوق وشوق کے اشعار کہتے کہتے یوں ہی ایک آدھ ضرب مغرب کو رسید کر دیتے ہیں ۔ بالِ جبریل کی اکثر غزلیں بہت ولولہ انگیز ہیں۔ اکثر اشعار میں حکمت اور عشق کی دلکش آمیزش ہے ۔ لیکن اچھے اشعار کہتے کہتے ایک شعر میں فرنگ کے متعلق غصّہ اور بیزاری کا اظہار کر دیتے ہیں اور پڑھنے والے صاحبِ ذوق انسان کو دھکا سا لگتا ہے کہ فرنگ عیوب سے لبریز سہی لیکن یہاں اس کا ذکر نہیں کیا جاتا تو اچھا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصفّا آبِ رواں کا لب جو بیٹھے لطف اُٹھا رہے تھے کہ اس میں یک بیک ایک مُردہ جانور کی لاش بھی تیرتی ہوئی سامنے آگئی ۔" اس تمہید کے بعد بالِ جبریل کی غزلوں اور نظموں سے کچھ اشعار اس قسم کے چُنے ہیں ۔ اور اپنے دعوے کو مثالوں کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔

تیسرے وہ نیاز مند ہیں جو فیشن کے طور پر اقبالؔ کی کتابوں ہی کو اپنے پاس نہیں رکھتے بلکہ انھوں نے اقبالؔ کے بہت سے ... اشعار بھی نوکِ زبان کر لیے ہیں ۔ جن کو موقع بہ موقع پڑھتے رہتے ہیں ۔ مگر ان کا مطلب اپنی پستیٔ فطرت اور کج فہمی کی وجہ سے کچھ کا کچھ سمجھتے ہوئے اسلامی تہذیب و ثقافت کو مسخ کرنے میں لگے ہوئے ہیں ۔

چوتھے وہ نیاز مند ہیں جو اقبالؔ کی کتابوں کی شرح لکھ رہے ہیں ۔ جن کی شروع اور تو سب کچھ ہوتا ہے مگر اشعار کی شرح نہیں ہوتی ۔ اور ان نیاز مندوں نے جا بجا اپنے آپ کو اقبالؔ کا شاگرد بھی کہا ہے اور بعض ان کتابوں کا اقبال سے سبقاً سبقاً پڑھنا بھی ظاہر کیا ہے جن کی شرح کر چکے ہیں ۔ ان شارحین میں سے ایک

صاحب نے یہ غضب کیا ہے کہ کسی شعر شرح بھی ڈھنگ سے نہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی شرح میں اقبالؔ کو اچھا خاصا خانقاہی صوفی بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں کہیں لفظِ عشق آیا ہے۔ اس کو پیر کے عشق سے تعبیر کیا ہے۔ نظر لفظ کو پیر کی توجہ اور تصور کو پیر کے تصور سے اور اسی طرح جتنے ایسے الفاظ آئے ہیں ان کو تصوف ہی کی اصلاحوں کے ساتھ منسوب کرتے چلے گئے ہیں۔ اور ایسے ہر شعر کی شرح کرتے سے پہلے یہ فقرہ بھی لکھتے رہے ہیں کہ اقبالؔ نے یہ شعر تصوف کے رنگ میں ڈوب کر کہا ہے۔ وہ تو خیر سے ان حضرت نے اقبالؔ کا کوئی خاص پیر فرض نہیں کیا ورنہ ہر شعر میں اس کا نام لے کر کہتے ہیں کہ اقبالؔ نے یہ شعر اپنے فلاں پیر کے رنگ میں ڈوب کر کہا ہے۔ ایک دوسرے شارح صاحب نے اقبالؔ کے کلام کا مطلب اس قدر اختصار کے ساتھ لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ان کے نزدیک اختصار ہی میں شعر بھی ہو جاتی ہے۔ اور اختصار ہی میں شعر کی تمام خوبیاں بھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اس لئے اختصار کا دامن کہیں نہیں چھوڑا ہے، خواہ مطالب اشعار کا دامن ہر ہر جگہ چھوٹتا رہا ہو۔ ان مطالبِ اشعار سے نہ ایک طالبِ علم مستفید ہو سکتا ہے نہ ایک ناظرِ کتاب۔

ان چار قسم کے نیاز مندوں میں، قوم کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے وہ نیاز مند ہیں جنھوں نے انکارِ حدیث کو اپنی زندگی کا مشن بنایا ہے۔ کیسا زبردست تضاد ہے اقبالؔ اور ان اقبالؔ کے افکار و اعمال کے درمیان! کہ وہ اقبالؔ جو عشقِ رسول صلعم میں شہرۂ آفاق، جو سنتِ رسول صلعم کا بھی ایسا ہی والہ و شیدا جیسا کہ کتاب اللہ کا، جو قرآن کریم کا مفسر تھا تو حدیث کا شارح بھی تھا بلکہ بقول "مولانا مودودی" حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں پرانے مولوی تک کان

کھڑے کرتے ہیں، یہ ڈاکٹر آف فلاسفی، ان کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا۔ اسلامی شریعت کے جن احکام کو بہت سے روشن خیال حضرات فرسودہ اور بوسیدہ قوانین سمجھتے ہیں اور جن پر اعتقاد رکھنا اُن کے نزدیک ایسی تاریک خیالی ہے کہ مہذب سوسائٹی میں اُن کی تائید کرنا ایک تعلیم یافتہ آدمی کے لئے ڈوب مرنے سے زیادہ بدتر ہے، اقبال نہ صرف ان کو مانتا اور ان پر عمل کرتا تھا بلکہ اس کو کسی کے سامنے ان کی تائید کرنے میں باک نہ تھا" اس اقبال کے بنیاز مند اور شاگرد حدیث سے بھی انکار کر رہے ہیں۔ اور اسلام کی تہذیب، کلچر اور روایات سے بھی!

کاش یہ منکرین حدیث مذکورۂ صدر بیان کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں تاکہ ان کو اپنے چہرے کی سیاہی نظر آ جائے! مگر اصلاح منظور کس کو ہے! بلکہ جس طرح ایک شخص اپنے وقت کی حکومت کے ہاتھوں بک کر دعوائے نبوت کر دیتا ہے۔ اور ملتِ اسلامیہ کے لئے ایسا عظیم فتنہ کھڑا کر جاتا ہے جس کی خرابیوں سے مسلمان قیامت تک نبٹتے رہیں گے اور دشمنانِ اسلام خوش ہوتے رہیں گے۔ اسی طرح یہ لوگ بھی ایسی ہی مادّی وجاہتوں اور ذاتی فائدوں کی خاطر انکارِ حدیث کے ذریعہ قوم میں انتشار پھیلانا اپنا فرضِ منصبی سمجھ لیں تو کونسی تعجب کی بات ہے! اور قرآنِ کریم کے ماننے کا تو ایک فریب ہے جو سادہ لوح عوام کے لئے گھڑا گیا ہے۔ ورنہ کوئی اِن مکاروں سے یہ پوچھے کہ وہ قرآنِ کریم کے ماکیونکر مانتے ہیں۔ آخر اس کے لئے بھی تو اُن کے پاس تواتر کے سوا اور کوئی سند نہیں ہے۔ قرآنِ کریم کے ماننے کا دعویٰ اور حدیث سے انکار ہے۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!

کیا دنیا میں سب بیوقوف ہی بستے ہیں۔ کیا یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ اسلام دشمن لوگ اسلام کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت دینے والی چیز تو سنّت اور صرف سنّت ہی ہے۔ سنّت کو درمیان سے ہٹا دینے کے بعد دین کی کونسی شکل باقی رہ جاتی ہے۔ جیسا کہ مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں کہ "سنّت درحقیقت اُن اصولوں کا ایک فرضی مقتضیٰ ہے جو قرآنِ کریم میں بیان ہوئے ہیں۔ اگر سنت کو سامنے سے ہٹا دیجئے تو قرآنِ کریم ایک بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔ اور ہر مسخرا اس کی آیتوں کو اغراض و اہوا کی وادیوں میں گھسیٹتا پھرے گا۔ قرآنِ کریم کے اصولوں پر سنّت کے سوا کوئی اور خول چڑھانا قرآنِ کریم کے سارے اصولوں کو غارت کر کے رکھ دینا ہے۔ اس قامت پر صرف سنّت ہی کا جامہ راست آسکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور جامہ اس کو پہنانے کی کوشش کی گئی تو اس کا سارا حلیہ ہی مسخ ہو کر رہ جائے گا"۔[۱]

لہٰذا انکارِ حدیث کو انکارِ قرآن کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیئے کہ انکارِ قرآنِ کریم حدیث کے انکار کا ایسا لازمی و منطقی نتیجہ ہے جس سے کوئی بھی صاحبِ عقل ورائے انکار نہیں کر سکتا۔ بلکہ انکارِ قرآنِ کریم معاً تو شروع بھی ہو گیا ہے اس لئے کہ قرآنِ کریم کی الٹی الٹی سیدھی تفسیریں کی جا رہی ہیں کہ آج تک کسی نے دیکھی نہ سنیں۔ اور وہی طریقہ تاویل کام میں لایا جا رہا ہے۔ جو اس ملک کے کاذب نبی نے اختیار کیا تھا اور جس کو اس کی اُمّت کے مفسدوں نے ترقی دے کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ یعنی قرآنِ کریم کے سانچے میں ڈھالنے کی بجائے قرآن

---

[۱] رسالہ ترجمان القرآن بابت صفر ۱۳۷۵ھ صفحہ ۵۸

کریم کو اپنے مذموم عزائم اور ناپاک نفسانی خواہشات کے سانچے میں ڈھالنے کی سر توڑ کوشش کی جا رہی ہے۔ اور یہ تفسیر بالرائے سے بھی زیادہ خطرناک اقدام ہے۔ اگرچہ ہمارا الیقین ہے کہ جب قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا ہے تو یہ دشمنانِ اسلام قرآن و حدیث سے انکار کرکے کبھی نہ قرآن کریم کو مٹا سکیں گے نہ حدیث کو۔ بلکہ اسلام کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی اسلام کے لئے ایسے فتنے کھڑے کرکے اسلام کے آفتاب کو گرد و غبار میں چھپا دینے کی ناپاک کوششیں کی گئی ہیں، اسلام کی درخشانی و تابانی میں اور ترقی ہوئی ہے ؎

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

مگر قوم میں ایک وقتی انتشار ضرور پھیلتا ہے اور دوسری اقوام کو ان نام نہاد مسلمانوں کے ہاتھوں وہ ہتھیار ملتے ہیں جن سے وہ اسلام پر وار کرتے ہیں۔ اور مسلمان اپنی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو قوم کی ترقی و تعالی اور نشر و اشاعت میں صرف کرنے کی بجائے ان دشمنوں سے عہدہ برآ ہونے میں صرف کردیتے ہیں۔ اور یہ وہ قومی نقصان ہے جس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ اور یہی ہو رہا ہے کہ ایک طرف مرزائیت اپنے پورے مادی وسائل کے زور سے اسلام کی تخریب کر رہی ہے تو دوسری طرف ثقافتِ اسلام کے نام پر ہر قسم کی غلاظت اسلام پر ڈالی جا رہی ہے۔ اور تیسری طرف منکرین حدیث بھانت بھانت کی بولیوں سے مسلمانوں کے دماغ میں الجھن اور دلوں میں وسوسے پیدا کر رہے ہیں۔ اور چوتھی سمت پر وہ مغرب زدہ گروہ ہے۔ جو یہاں تک مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہے کہ جو بات اہل مغرب کہیں وہی ان کے نزدیک درست اور قابل قبول ہے۔ اس طرح اسلام چاروں طرف سے نرغے میں آیا ہوا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا

ہے کہ یہ چاروں گروہ ایک ہی لشکر کے چار حصے ہیں جو اسلام پر چار طرف سے حملہ آور ہونے کے لیے تقسیم ہو گئے ہیں۔ اور شدتِ عداوت کے ساتھ حملہ کر رہے ہیں کہ اس عداوت میں اور سب کی سنتے ہیں مگر نہیں سنتے تو اسلام کی نہیں سنتے خواہ وہ قرآنِ کریم کی زبان سے دہائی دے خواہ حدیث کی زبان سے اور خواہ جانشینانِ رسولؐ (علماء و صلحاءِ امت) کی زبان سے۔

بہر حال مقالے کو اسی تلخ نوائی پر ختم ہونا تھا۔ مگر ہم اس سے خوش ہیں اس لئے کہ اقبال پسند حضرات کو ایک لمحہ فکریہ کا موقع دے سکتی ہے اور اگر انہوں نے ذرا بھی غور و فکر سے کام لیا تو ان نیاز مندوں کو ان کی اصلی صورت دیکھ کر خود بھی ان کے دامِ فریب سے بچیں گے اور دوسروں کو بھی بچانے کی تدبیر کر سکیں گے۔ کہ یہ قوم کی بہت بڑی خدمت ہے۔ آخر میں ہم مولانا عبد الماجد دریا بادی کی وہ ہدایت نقل کر کے مقالے کو ختم کرتے ہیں۔ جو انہوں نے اقبال پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال پسندوں کے لیے ارشاد فرمائی ہے:-

"اقبال اور جوہر (مولانا محمد علی مرحوم) کا رنگ عملی دنیا میں ایک دوسرے سے الگ رہا۔ لیکن نظر سطح سے گذر کر تہہ تک پہنچے اور محض عمل نہیں محرکاتِ عمل سامنے ہوں تو ہر دیکھنے والا دیکھ لے گا کہ دونوں ایک ہی مٹی سے پیدا، سرشت ایک، طینت ایک، قالب دو، روح ایک، حبِ اسلام کے جنون میں دونوں گرفتار، عشقِ رسولِ اسلامؐ کے جام سے دونوں سرشار، ایک کی سیاست دوسرے کی شاعری دونوں

اُسی رنگ سے رنگین۔ فرق اتنا کہ ایک کے کلام میں حکیمانہ ذوقِ عرفان دوسرے کے قلم و زبان میں جوشِ طوفان، دونوں دُنیا میں جیئے تو اسلام کی توحید کا کلمہ پڑھتے پڑھتے ہوئے دونوں دُنیا سے اُٹھے تو "آبروئے نامِ مصطفےٰؐ" کا وظیفہ جپتے ہوئے! ایک نے چہرۂ سیاست کا نقاب دوسرے کے نام کا سخن گویوں کی محفل سے انتساب، حقیقتاً نہ یہ شاعر نہ وہ سیاسی لیڈر. خدا آپ حضرات کو توفیق دے کہ آپ اقبالؔ کے اصلی مقام کو پہچانیں اور کلام کے ابتدائی دور کو چھوڑ کر اس کے وسطی اور آخری حصّوں کو پڑھ کر اس کی رُوح اور مغز تک پہنچیں"۔

☆ ختم شُد ☆

ہماری معیاری مطبوعات

قرآن مجید مترجم ع ۸۱ مترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ
ہدیہ مجلد ریگزین -/۳۲

قرآن مجید معریٰ ع ۳ بہترین چکنا کاغذ عمدہ جلد
ہدیہ مجلد ریگزین -/۲۵

بال جبریل مع شرح "پروفیسر یوسف سلیم چشتی صفحات ۸۱۶ قیمت -/۳۳

صحیح بخاری شریف مترجم مصنفہ ابو عبد اللہ مترجم مولانا عبد الحکیم خان ہدیہ کامل -/۲۵۰

جامع الترمذی مترجم (عکسی) از تالیف مولانا بدیع الزماں قیمت کامل -/۱۵۰

سید الانبیاء ترجمہ الوفا مصنفہ امام عبد الرحمٰن ابن جوزی مترجم محمد اشرف سیالوی قیمت -/۷۵

جدید عصری لغت (باتصویر) قیمت -/۲۱
جیبی تعلیم اللغات اردو (باتصویر) " ۷/۵۰
تعلیمی عربی اردو، اردو عربی لغات " -/۱۵
جیم پاکٹ ڈکشنری اردو۔ انگلش " ۷/۵۰
" " انگلش اردو " ۷/۵۰
کنسائز ڈکشنری انگریزی اردو " -/۱۵
ڈکشنری اردو انگریزی " -/۳۵
" انگریزی اردو " -/۳۵
کنسائز۔ انگلش ان ٹو انگلش اور اردو ڈکشنری قیمت -/۲۰
اسٹینڈرڈ۔ انگلش سے انگلش اور اردو ڈکشنری " -/۹۰
داستان ایمان فروشوں کی (مکمل تاریخ اسلام) التمش، قیمت کا ۲ سٹ پانچ حصص -/۱۳۰